ماہنامہ

براہِ راست

لاہور

جلد 12 شمارہ 06

جون 2026ء

حماس کے شہید کمانڈر

عزالدین الحدّاد

کا سوانحی خاکہ

اور اب: القدس کی باری، نئے نکبہ کی تیاری

غزہ میں نسل کشی جاری، مسجد اقصیٰ کا محاصرہ تنگ

پاکستان ابراہیمی معاہدے پر
دستخط کرنے کے اشارے کا منتظر

فریڈم فلوٹیلا پر حملہ:
شرکائے صمود پر جنسی تشدد،
برہنہ پا کر دیے گئے

یورپی یونین اور اسرائیلی اشتراک
خفیہ گوشے بے نقاب

حماس کے شہید کمانڈر عزالدین الحدّاد کا سوانحی خاکہ

عزالدین الحداد 1970 میں غزہ میں پیدا ہوئے اور ان کا تعلق شہر کے مشرقی علاقے التفاح سے تھا۔ وہ 1987 میں تحریک حماس کے قیام کے ساتھ ہی اس میں شامل ہو گئے اور بعدازاں القسام بریگیڈز کے خفیہ یونٹ ''مجد'' میں خدمات انجام دیں، جہاں ان کی ذمہ داری مبینہ طور پر اسرائیل کے لیے جاسوسی کرنے والے افراد کی نگرانی اور ان کے خلاف کارروائیاں کرنا تھی۔

عسکری سفر

عزالدین الحداد نے القسام بریگیڈز میں ایک عام مجاہد کے طور پر اپنی جدوجہد کا آغاز کیا اور مرحلہ وار ترقی کرتے ہوئے فیلڈ کمانڈر، پھر بٹالین کمانڈر اور بعدازاں 2021 میں باسم عیسیٰ کی شہادت کے بعد غزہ بریگیڈ کے کمانڈر مقرر ہوئے۔ وہ القسام کے محدود عسکری شوریٰ کے رکن بھی رہے، اور بعد میں اپنے پیش رو کمانڈروں کی شہادت کے بعد قیادت کے اعلیٰ منصب تک پہنچے۔

''ابوصہیب'' ایک پراسرار شخصیت

عزالدین الحداد ''ابوصہیب'' کے لقب سے معروف تھے۔ اسرائیل کی جانب سے 2009، 2012 اور 2021 میں ان پر کئی قاتلانہ حملے کیے گئے، تاہم وہ ان حملوں میں محفوظ رہے۔ حالیہ جنگ کے دوران بھی ان پر متعدد مرتبہ حملے کیے گئے جبکہ ان کے دو بیٹے، صہیب اور مؤمن، مختلف اسرائیلی حملوں میں شہید ہو گئے۔

اسرائیل نے ان کے بارے میں معلومات فراہم کرنے والوں کے لیے بھاری انعام کا اعلان بھی کیا تھا، جبکہ اسرائیلی میڈیا انہیں اپنی خفیہ نقل و حرکت اور روپوش رہنے کی صلاحیت کے باعث ''بھوت'' قرار دیتا رہا۔

''طوفان الاقصیٰ'' میں کردار

طوفان الاقصیٰ آپریشن سے قبل عزالدین الحداد نے غزہ بریگیڈ کے ماتحت کمانڈروں کو خفیہ طور پر طلب کیا اور انہیں القسام کے شعار والی ایک تحریری ہدایت دی، جس میں لکھا تھا:

''فیصلہ کن فتح پر ایمان رکھتے ہوئے؛ بریگیڈز کی قیادت نے عظیم فوجی آپریشن 'طوفان الاقصیٰ' کے آغاز کی منظوری دے دی ہے۔ اللہ پر بھروسہ کرو، بہادری سے لڑو، مطمئن دل کے ساتھ اپنا فرض ادا کرو، اور 'اللہ اکبر' کو اپنے فخر کا نعرہ بناؤ۔''

آپریشن کے دوران اہم ہدایات

آپریشن کے ابتدائی گھنٹوں میں بڑی تعداد میں اسرائیلی فوجیوں کو گرفتار کرنے پر زور دیا گیا۔ اسرائیلی بستیوں اور فوجی مراکز پر حملوں اور کنٹرول کے مناظر براہِ راست نشر کرنے کی ہدایت دی گئی۔

اسرائیلی الزامات اور حالیہ اہداف

اسرائیل عزالدین الحداد پر سات اکتوبر کے حملے کی قیادت میں شرکت کا الزام عائد کرتا ہے۔ اسرائیلی مؤقف کے مطابق وہ القسام کے دیگر رہنماؤں کے ساتھ اس کارروائی کی منصوبہ بندی میں شامل تھے، جبکہ جنگ کے دوران غزہ میں موجود اسرائیلی قیدیوں کی حفاظت اور نگرانی کی ذمہ داری بھی ان کے سپرد تھی۔

15 مئی 2026 کو اسرائیل نے اعلان کیا کہ اس نے غزہ شہر کے مغربی علاقے الرمال میں فضائی حملوں کے دوران عزالدین الحداد کو نشانہ بنایا ہے۔

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

وہ (ذات) پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام یعنی (خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں لے گیا تاکہ ہم اسے اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھائیں۔ بیشک وہ سننے والا (اور) دیکھنے والا ہے۔

ماہنامہ

براہِ راست

لاہور

جلد 12 شمارہ 04 جون 2026ء

مُدیر: مرزا محمد الیاس

ویب سائٹ: www.barah-i-rast.com

برقی پتہ ادارتی امور: editor@barah-irast.com

برقی پتہ انتظامی امور: contact@barah-i-rast.com

Price Rs.70

پبلشر مرزا محمد الیاس نے شرکت پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر 9/1A رائل پارک لاہور سے شائع کیا

اس شمارے میں

■ کلام اقبال ■ اداریہ

پاکستان ابراہیمی معاہدے پر کب دستخط کرے گا؟

اور اب بیت المقدس کی باری ہے، نئے نکبہ کی تیاری ہے

مسجد اقصیٰ: کسی ہیکل پر تعمیر نہیں کی گئی

امتمار بن غفیر کا دعویٰ: مسجد الاقصیٰ میری ملکیت ہے

غزہ میں فضائی حملوں کے بعد اب زمینی موذی جانوروں کا عذاب

اپنے ہی ہاتھوں اپنے خوابوں کی تدفین

استعمار کا برہنہ چہرہ

غزہ میں نسل کشی تا حال جاری ہے

یورپی یونین کا اسرائیل کے ساتھ جاری مشکوک اشتراک

عراقی صحرا میں اسرائیلی خفیہ اڈہ؟

امریکی میڈیا میں اسرائیل نواز تعصب کے ناقابل تردید ثبوت

محمود خلیل کیس میں نیا موڑ

نیویارک میں اسرائیلی ریئل اسٹیٹ میلہ

مائیکروسافٹ اسرائیل کے سربراہ کی برطرفی

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یار ہوگا

کلامِ اقبال

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا، وہ راز اب آشکار ہوگا
گزر گیا اب وہ دورِ ساقی کہ چُھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہاں میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا
کبھی جو آوارۂ جنوں تھے، وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی، مگر نیا خار زار ہوگا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قُدسیوں سے میں نے، وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دُکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زِرکم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیاں بنے گا ناپائیدار ہوگا
خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنو گا جس کو خدا کے بنوں سے پیار ہوگا

اداریہ

مسجد اقصیٰ کو بچایئے

قبلۂ اول مسجد اقصیٰ کو ختم کرنے کے آپریشن کا نیا مرحلہ شروع کر دیا گیا ہے۔ مسجد کے معاملات سے اسرائیل کے وزیر قومی سلامتی اتمار بن غفیر کا کوئی تعلق قانوناً، اخلاقاً اور دیگر کسی اعتبار سے نہیں ہے لیکن یہی وزیر موصوف روزانہ کی بنیاد پر یہودی آبادکاروں کے ایک جتھے کو لیے آن دھمکتا ہے۔ اس نے اب اعلانات برائے مسجد اقصیٰ کا بھی ٹھیکہ لے لیا ہے۔ مسجد کے جملہ امور سے مسلمانوں کو الگ کر کے مسلم اوقاف کو ختم کر دیا ہے۔ مسجد کو یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان وقت کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ پہلا وقت آبادکار یہودیوں کے لیے رکھا گیا ہے۔ یہ وقت اور مسجد کے اندر داخلے کے نئے قواعد تیار کیے جا رہے ہیں اور اب تمام تر انتظامات حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں۔

اصولی طور پر مسجد اقصیٰ کے امور ایک مسلم اوقاف چلاتا ہے جس کی نگرانی اور ذمہ داری حکومت اردن کے ذمے ہے۔ وہی اس کے اخراجات ادا کرتی ہے۔ اب یہ اعلان کیا گیا ہے کہ مسجد کا کوئی مسلم اوقاف باقی نہیں رہا ہے۔ اب اس کے لیے کسی اوقاف کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ حکومت اردن کہنے کو ایک الگ ملک کی حکومت ہے لیکن عملی طور پر اسرائیل کا ایک صوبہ محسوس ہوتی ہے۔ مسجد کے امور سے الگ تھلگ رہتی ہے۔ کسی نوعیت کا اقدام نہیں کرتی ہے۔

یہ اقدامات مسجد کو واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم کرنے کا اعلان ہے۔ اسے دو حصوں میں تقسیم کرنے کا عمل جاری رہا اور مسلم اوقاف واقعی ختم کر دیا گیا تو یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے گا۔ ایک بار یہودیوں کو مسجد اقصیٰ کا اس طرح سے داخلہ جائز قرار دے دیا گیا تو مسجد کی تباہی اور پوری مسجد پر یہود کے قبضے کا خواب ایک قدم اور بڑھ جائے گا۔

مسجد اقصیٰ میں کیا ہو رہا ہے؟ اب یہودیوں کے داخلے کی تعداد 100 سے بڑھا کر 150 کر دی گئی ہے۔ مسجد سے ملحقہ آبادی سلوان کو خالی کرایا جا رہا ہے۔ فلسطینیوں سے اب گھروں کے پرمٹ طلب کیے جا رہے ہیں۔ یہ اسی طرح ہے کہ صدیوںؒ سے آباد سلوان کے رہائشی مسلمانوں سے اچانک کہا جائے کہ آپ اس گھر میں، جہاں رہ رہے ہیں، کا پرمٹ دکھائیں۔ اس طرح اس اہل خانہ کو سڑک پر لا کھڑا کیا جاتا ہے۔ بچے، بوڑھے اور خواتین سمیت افراد کو یوں سرعام بے سرو سامان نکلنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔

وادیٔ سلوان میں یہ اقدام یہاں یہودی رہائشی یونٹ قائم کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ اس اقدام سے مسجد اقصیٰ کے اطراف پر قبضہ جما لیا جائے گا جس سے کسی بھی مختصر نوٹس پر یہودی آبادکاروں کو مسجد اقصیٰ میں طلب کیا جائے گا۔ اب تک ہر کام میں اتمار بن غفیر خود شامل رہا ہے۔

مسجد اقصیٰ کے امور سے اسلامیان عالم کی لاتعلقی کسی اعتبار سے سمجھ سے بالاتر ہے۔ مسلمانوں میں بھی ایک حصہ ایسا رہا ہے اور اب بھی ہے جو یہ تصور دل و دماغ میں بٹھائے ہوئے ہے کہ مسجد پر یہودیوں کا حق ہے کیوں کہ یہ ہیکل سلیمانی کی جگہ ہے۔ یہ خام خیالی مسلمانوں کی مسجد سے لاتعلقی سے جڑی ہوئی حقیقت ہے۔ یہ بات ان کو کئی بار باور کرائی گئی کہ یہ خیال تاریخی اعتبار سے غلط ہے، جھوٹ اور فراڈ ہے۔ ہیکل کی جگہ مسجد کے قریب ضرور تھی اور مسجد اقصیٰ کی تعمیر بھی ہیکل بنانے والے پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام سے منصوب ہے۔ یہودی تابوت سکینہ کی حفاظت تو کر نہیں سکے جو اصل شے ہے اور قرآن نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

ایک اور غلط فہمی بھی ہے جو بہت عام ہے۔ مسلمان گنبد اطلس کو مسجد اقصیٰ سمجھتے ہیں۔ اسے میڈیا مہمات میں مسجد کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ بالکل بالکل خیال ہے۔ گنبد اطلس وہ مقام ہے جہاں ایک پہاڑی موجود ہے، گنبد اس کے اوپر تعمیر کیا گیا ہے۔ یہیں سے نبی علیہ السلام حضرت محمد ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تھے، بعد میں اس پر گنبد تعمیر کیا گیا۔ یہ سنہری گنبد پہلے موجود ہی نہیں تھا۔ مسجد اقصیٰ اس سے ذرا فاصلے پر موجود ہے۔ مسجد سینکڑوں ایکڑ پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہودیوں نے وہاں سے ہیکل سلیمان کے نشان کی تلاش کے بہانے اس کے تہہ خانے کھود ڈالے ہیں۔ مسجد کی بنیادوں کو کمزور کیا جا رہا ہے۔ اب تک انہیں اس تہہ خانوں سے ہیکل کا سراغ تک نہیں مل سکا ہے۔ اس کے باوجود زیریں کھدائی جاری ہے۔

مسجد اقصیٰ کی ہیئت، انتظامات، مسلم اوقاف میں ہونے والی تبدیلیاں اقوام متحدہ کی کئی قراردادوں کی رو سے غیر قانونی ہے۔ لیکن مسلم ممالک چپ سادھے ہوئے ہیں۔ یہ رَوش جاری رہی تو کسی وقت مسجد اقصیٰ کے شہید کیے جانے کی خبر آ سکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مسجد کے اردگرد بلند و بالا یہودی بستیاں تعمیر کر دی جائیں۔ یہ کام شروع ہے اور اس کی نگرانی سموٹریش کرتے ہیں۔

یروشلم یعنی بیت المقدس کو اقوام متحدہ لانے مشرقی اور مغربی مقبوضہ میں تقسیم کر رکھا ہے۔ مشرقی بیت المقدس پر اب قبضے، وہاں سے فلسطینی آبادی کے خاتمے اور غیر قانونی یہودی آبادکاری جاری ہے۔ متعدد یہودی یہاں سے مذہبی جلوس نکالتے رہتے ہیں۔ اس دوران میں سارے علاقے کو مسلمانوں کے لیے ایک طرح سے سیل کر دیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ مسجد اقصیٰ کے قرب و جوار میں فلسطینی آبادی کو ہراساں کیا جائے لیکن یہی فلسطینی ہیں جو نماز جمعہ، عیدین کی نمازوں اور دیگر مواقع کے اجتماعات میں ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔ مسجد میں داخلے اور عبادات کی مسلسل کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اب اتمار بن غفیر کی ہدایت پر کہا گیا ہے کہ کسی بھی موقع پر ان کی تعداد 600 سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ ہر مرتبہ پرمٹ جاری کیے جائیں گے اور مسجد کے قریب آنے کی اجازت بھی صرف انہی کو ہوگی۔

بورڈ آف پیس اور ابراہام معاہدہ

امریکہ اور اسرائیل کی ایران پر جنگی جارحیت نے عجب صورت حال پیدا کر دی ہے۔ غزہ اور دیگر مقبوضہ علاقوں مغربی کنارے اور مقبوضہ مشرقی بیت المقدس میں تشدد پر مبنی اقدامات میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ فلسطینی آبادی کو جبری بے دخلی کا سامنا ہے۔

اب صدر ٹرمپ کا بیان سامنے آیا ہے جس میں متعدد ملکوں سے کہا گیا ہے کہ وہ ابراہام معاہدوں میں شریک ہو جائیں۔ اس شراکت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسرائیل کو جائز اور قانونی ملک تسلیم کر لیں۔ جن ملکوں سے کہا گیا ہے کہ وہ ان معاہدوں میں شرکت اختیار کر لیں ان میں پاکستان اور سعودی عرب بھی شامل ہیں۔ لیکن ان ملکوں نے محتاط انداز میں سفارتی معذرت کر لی ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ سفارتی معذرت دراصل ایک پردہ اوڑھنے کا اقدام ہے۔ صاف الفاظ میں انکار نہیں کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کہا گیا ہے کہ ذرا صبر کیجئے، جنگ ختم ہونے دیں، ہم آپ کے حکم کی تعمیل کر لیں گے۔

اسی سے جڑا بورڈ آف پیس کا معاملہ ہے۔ پہلے یہ معاملہ بڑی شد و مد سے اٹھایا گیا تھا تاکہ غزہ کے امور کی نگرانی کے لیے ایک حکومتی انتظار کی راہ ہموار ہو سکے۔ غزہ کو فلسطینیوں سے زبردستی خالی کرا کے صدر ٹرمپ اور ان کے داماد جیرڈ کشنر کی خواہشات کے مطابق مشرق وسطیٰ میں عیاشی کے اڈے (Riveria) میں تبدیل کیا جا سکے۔ یہ اقدامات ابھی ادھورے ہیں۔ عیاشی کے اڈے کے حصہ داروں میں پھوٹ پڑ چکی ہے۔ ان میں سے ایک حصہ دار متحدہ عرب امارات بہت آگے نکل گیا ہے۔ وہ دبئی وغیرہ کو دوسرے اسرائیل میں تبدیل کرنے کے اقدامات کر رہا ہے۔ محمد بن زید ایک طرف اسرائیل کی جنگی ضروریات میڈیں شامل ہے، دوسری طرف مصر نے اپنے جنگی طیارے یو اے ای بھیج دیے ہیں۔ تیسری طرف یو اے ای نے امریکی ضروریات کے لیے سعودی عرب سے چھیڑ خانی شروع کر دی ہے۔ یہ سب بورڈ آف پیس کے ارکان ہیں۔ ان کے اندر اتحاد اور اتفاق نہیں ہے۔ اپنے اپنے مفادات کے تحت کام کر رہا ہے۔ ان کے اقدامات مسلم ممالک میں منافقت کی خبر دے رہے ہیں۔

جہاں تک صدر ٹرمپ کے غزہ کے لیے بیس نکاتی پروگرام کا تعلق ہے، یہ عملی طور پر مر چکا ہے۔ یہ غزہ میں فلسطینیوں کی تباہی اور نسل کشی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ غزہ میں اسرائیلی فوج کے انخلاء کا پروگرام ایک ڈرامہ بن کے رہ گیا ہے۔ ایک نام نہاد یلو لائن کے پیچھے اسے نکلنے کا کہا گیا تھا۔ اس پر عمل درآمد یوں ہو رہا ہے کہ غزہ کو اس کی طوالت کے تحاظ سے دو حصوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اسرائیلی فوجی نے وہاں یلو لائن کے ساتھ ساتھ بفر زون قائم کر دیا ہے۔ اس پر اس نے ساٹھ چیک پوائنٹ بنا دیے ہیں۔ ان کے قریب غلطی سے بھی قریب جانے والے کو گرفتار کر لیا جاتا ہے یا کوئی مار دی جاتی ہے۔ اس طرح یہ لائن غزہ پر اسرائیلی قبضے کی لائن میں تبدیل کر دی گئی ہے۔ اسرائیل غیر قانونی طور پر بفر زون کے رقبے میں اضافہ کرتا جا رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں قبضہ بڑھاتا جا رہا ہے۔

فلسطینی آبادی پر اسرائیل کے حملے جاری ہیں۔ جنگ بندی کے نام نہاد اعلان کے بعد سے نسل کشی جاری ہے۔ اسرائیل جب چاہتا ہے، فلسطینی ابادی پر فائرنگ کرتا ہے۔ اب تک سینکڑوں شہید کیے جا چکے ہیں۔ جو ان حملوں سے بچ نکلتے ہیں، ان میں سے گرفتاریاں عمل میں لائی جاتی ہیں۔

بورڈ آف پیس عملی طور پر ناکام ہو چکا ہے۔ اس میں جن ممالک کو شرکت کا کہا گیا تھا، وہ صدر ٹرمپ کے بقیہ دو سال مکمل ہونے کے انتظار میں لگتے ہیں۔ ان کی صدارت کے خاتمے کے ساتھ ہی بورڈ آف پیس کے انتقال کر جانے کی خبر آ سکتی ہے۔

دنیا کو، بالخصوص عالم اسلام، چین، روس، فرانس اور جرمنی کو اس صورت حال کا جائزہ لینا چاہیے۔ حماس سے غیر مسلح ہونے کا مطالبہ درست نہیں ہے۔ ٹرمپ پلان میں حماس کے غیر مسلح ہونے کا کہا گیا تھا۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک غزہ میں پولیس کا نظام نہیں بن جاتا۔ غزہ کی فوج تیار نہیں ہو جاتی۔ اس لیے حماس سے اس وقت تک غیر مسلح ہونے کا مطالبہ غیر حقیقی اور غیر منطقی ہے۔ بورڈ آف پیس کی ناکامی کا امریکہ و اسرائیل کو اعتراف کر لینا چاہیے۔ غزہ میں ساحلی تفریح گاہ کے منصوبوں پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ان پر اصرار بے فائدہ ہوگا۔

پاکستان ابراہیمی معاہدے پر کب دستخط کرے گا؟

آج معروف برطانوی اخبار 'انڈیپنڈنٹ' کی یہ کہانی اور ہیڈ لائن پڑھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ خبر کی سرخی یہ تھی کہ اگر پاکستان نے وہ کر دیا جو صدر ٹرمپ کہہ رہے ہیں، تو پاکستان کو اپنے تمام پاسپورٹ دوبارہ چھاپنے پڑیں گے۔ وجہ سادہ ہے۔ پاکستانی پاسپورٹ کے ایک صفحے پر، انگریزی اور اردو دونوں میں، ایک جملہ درج ہے۔ ''یہ پاسپورٹ اسرائیل کے سوا دنیا کے تمام ممالک کے لیے کارآمد ہے۔'' یہ جملہ کوئی نیا نہیں۔ یہ جملہ ریاستِ پاکستان کی پیدائش کے ساتھ کا ہے۔ اور نومبر دو ہزار پچیس میں، جب نئے بائیومیٹرک پاسپورٹ کے ڈیزائن پر سینیٹ کی قائمہ کمیٹی میں سوال اٹھا، تو ڈائریکٹر جنرل پاسپورٹ نے واضح کیا کہ یہ جملہ بدستور موجود ہے، صرف سکیورٹی فیچر بدلے گئے ہیں۔

ایک سفارتی پیغام، جو ایک چھوٹے سے کاغذی پرزے پر ستتر سال سے چھپا چلا آ رہا ہے۔ اور آج، دو ہزار چھبیس میں، وہی پرزہ ایک شہ سرخی بن گیا ہے۔

مگر میری دلچسپی پاسپورٹ میں نہیں۔ میری دلچسپی اُس کھیل میں ہے جو اِس پاسپورٹ کے اوپر، بہت اونچی میزوں پر، کھیلا جا رہا ہے۔ اور وہ کھیل سمجھنے کے لیے ہمیں ایک قدم پیچھے ہٹنا ہوگا۔

پہلے حقائق۔ گزشتہ ہفتے کے روز امریکی صدر نے آٹھ مسلمان ملکوں کے سربراہوں سے ٹیلیفون پر بات کی۔ پیر کو اپنی پوسٹ میں اعلان کیا کہ اب اِن ممالک کے لیے ابراہام معاہدے پر دستخط ''لازمی'' ہیں۔ سب سے پہلے سعودی عرب اور قطر، باقی پیچھے پیچھے۔ ساتھ سینیٹر لنڈسی گراہم کی دھمکی، کہ انکار کے ''سنگین نتائج'' نکلیں گے۔ یہ منظر، اوپر سے، طاقت کا منظر لگتا ہے۔ ایک سپر پاور اپنے اتحادیوں کو حکم دے رہی ہے۔

مگر سفارت کاری میں جو چیز اوپر سے نظر آتی ہے، وہ شاذ و نادر ہی اصل چیز ہوتی ہے۔ اصل چیز ہمیشہ نیچے، خاموشی میں، دبی ہوتی ہے۔

اب آیئے اُس بنیادی شرط کی طرف، جس پر سارا کھیل ٹکا ہے۔ سعودی عرب نے، اکتوبر سات کے بعد سے، ایک ہی بات دہرائی ہے۔ اسرائیل کے ساتھ تعلقات اُس وقت تک نہیں، جب تک ''فلسطینی ریاست کا قابلِ اعتبار راستہ'' نہ بنے۔ نومبر دو ہزار پچیس میں محمد بن سلمان نے وائٹ ہاؤس میں، خود ٹرمپ کے سامنے، یہی بات کہی۔ یہ سعودی موقف کا مرکزی ستون ہے، اور اِس کے بغیر ریاض کوئی کاغذ نہیں چھوئے گا۔

اب دوسری طرف دیکھیے۔ اُسی نومبر دو ہزار پچیس میں، اُسی ہفتے، اسرائیلی وزیرِاعظم نیتن یاہو نے ایک انٹرویو میں صاف کہا۔ ''فلسطینی ریاست نہیں بنے گی، چاہے سعودیوں کے ساتھ تعلقات کی قیمت پر ہی کیوں نہ ہو۔'' یہ جملہ غور سے پڑھنے کا ہے۔ نیتن یاہو نے

فلسطینی ریاست کو سعودی تعلقات سے زیادہ مہنگا قرار دے دیا۔

اور یہاں اصل بات ہے۔ یہ صرف نیتن یاہو کی ضد نہیں ہے۔ اٹلانٹک کونسل اور چیتھم ہاؤس، دونوں کے تجزیے بتاتے ہیں کہ اسرائیل کی پوری سیاسی صف، نیتن یاہو سے لے کر اُس کے مخالف نیفتالی بینیٹ اور یائر لاپید تک، فلسطینی ریاست کو ناقابلِ قبول سمجھتی ہے۔ یہ کسی ایک جماعت کا موقف نہیں، یہ آج کے اسرائیل کا قومی اجماع ہے۔

تو منظر یہ بنا۔ سعودی عرب کہتا ہے، فلسطینی ریاست کا راستہ دکھاؤ تو دستخط کریں۔ اسرائیل کہتا ہے، فلسطینی ریاست کسی قیمت پر نہیں۔ یعنی وہ واحد چابی جو اِس تالے کو کھول سکتی ہے، وہی چابی اسرائیل بنانے سے انکاری ہے۔

یہ تالا کسی چابی سے نہیں کھلتا، کیونکہ چابی بنانے والے نے چابی توڑ دی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ٹرمپ کو یہ معلوم نہیں؟ کیا واشنگٹن کے اُس کمرے میں، جہاں یہ پالیسی بنی، کوئی ایسا نہیں جسے یہ سادہ سی بات سمجھ آتی؟ کشنر، جنہوں نے دو ہزار بیس میں اصل ابراہام معاہدہ ترتیب دیا تھا، کیا اُس سے یہ منطق چھپی ہوئی ہے؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہ لوگ سب جانتے ہیں۔ اور یہی اِس کھیل کا اصل نکتہ ہے۔ میری رائے میں ٹرمپ یہ دباؤ عربوں اور پاکستان پر نہیں ڈال رہے۔ وہ یہ دباؤ، اِس عوامی شور کے ذریعے، ایک اور شخص پر ڈال رہے ہیں۔ اور وہ شخص تل ابیب میں بیٹھا ہے۔

ذرا سوچیے۔ ٹرمپ جانتا ہے کہ سعودی عرب دستخط نہیں کرے گا۔ پاکستان دستخط نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ شرط، جو دونوں مانگتے ہیں، نیتن یاہو دینے سے انکاری ہے۔ تو جب یہ سارا منصوبہ ناکام ہوگا، تو انگلی کس پر اٹھے گی؟ عربوں پر نہیں، جنہوں نے ایک معقول شرط رکھی۔ بلکہ اُس پر، جس نے وہ معقول شرط ماننے سے انکار کیا۔ ٹرمپ نے بڑی مہارت سے ناکامی کا ملبہ پہلے ہی نیتن یاہو کے دروازے پر رکھ دیا ہے۔

یہ وہی پرانی چال ہے جو میں نے کئی بار، کئی کمروں میں، چھوٹے پیمانے پر دیکھی ہے۔ ایک فریق دوسرے فریق سے وہ کام نکلوانا چاہتا ہے جو وہ کھل کر نہیں کہہ سکتا۔ تو وہ ایک تیسری جگہ شور مچاتا ہے، تاکہ اصل ہدف خود سمجھ جائے کہ کھیل کس کے گرد گھوم رہا ہے۔

مجھے دو ہزار بارہ کا ایک منظر یاد آتا ہے، جب لندن میں ایک سفارتی دعوت میں، تب کے برطانوی چیف آف ڈیفنس نے مجھ سے کہا تھا کہ سفارت کاری میں سب سے بڑا فن یہ ہے کہ آپ کسی کو وہ بات منوا لیں جو آپ نے کبھی کہی ہی نہ ہو۔ ''اگر آپ براہِ راست دباؤ ڈالیں گے، تو مزاحمت آئے گی۔ اگر آپ ماحول بنا دیں، تو دوسرا فریق خود وہ فیصلہ کرے گا جو آپ چاہتے تھے، اور سمجھے گا کہ یہ اُس کا اپنا فیصلہ ہے۔'' یہ بات تب مجھے ایک دلچسپ سفارتی نکتہ لگی تھی۔ آج، اِس پورے منظر کو دیکھتے ہوئے، یہ ایک پیشین گوئی لگتی ہے۔

نیتن یاہو کے لیے یہ کھیل خطرناک ہے۔ اُس کا ملک اِسی سال، اکتوبر تک، انتخابات کی طرف جا رہا ہے۔ اُس کی حکومت اکتوبر سات کے بعد کے سب سے دائیں بازو کے اتحاد پر کھڑی ہے۔ اگر وہ فلسطینی ریاست کی طرف ایک قدم بھی بڑھائے، تو اُس کا اتحاد ٹوٹ جائے گا، اور اُس کی سیاسی موت ہو جائے گی۔ مگر اگر وہ یہ قدم نہ بڑھائے، تو ٹرمپ صاحب کا ''تاریخی امن منصوبہ'' ناکام ہوگا، اور دنیا کے سامنے وہ شخص نظر آئے گا جس نے امن کا دروازہ بند کیا۔ یعنی نیتن یاہو دونوں طرف سے پھنسا ہوا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں ٹرمپ اُسے دیکھنا چاہتا ہے۔

اب آیئے پاکستان کی طرف۔ کیونکہ اصل میں ہماری دلچسپی یہیں ہونی چاہیے۔ پاکستان اِس کھیل میں ایک غیر معمولی ایکٹر ہے، مگر اِس مہرے کی اپنی مجبوریاں ہیں۔ جنوری دو ہزار چھبیس میں، جب پاکستان غزہ کے ''بورڈ آف پیس'' میں شامل ہوا، تو دفترِ خارجہ کے ترجمان طاہر اندرابی نے واضح کیا کہ پاکستان ابراہام معاہدے کا حصہ نہیں بنے گا، اور یہ دونوں چیزیں آپس میں جوڑنا غلط ہے۔ وزیرِ دفاع خواجہ آصف نے اِس سے بھی صاف بات کی۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ بنیادی نظریات کا ٹکراؤ'' ہے، اور یہ بھی یاد دلایا کہ پاکستانی پاسپورٹ میں اسرائیل کا نام تک شامل نہیں۔

یہ بیانات سفارتی زبان میں ایک واضح ''نہ'' ہیں۔ مگر سفارت کاری میں ''نہ'' کو کبھی اونچی آواز میں نہیں کہا جاتا۔ اِسے ایسے لہجے میں کہا جاتا ہے جو اپنے پیچھے گنجائش چھوڑ جائے۔ پاکستان نے یہی کیا۔ اُس نے انکار بھی کیا، اور دروازہ مکمل بند بھی نہیں کیا۔

مگر سچ پوچھیں تو پاکستان کے لیے یہ معاملہ نظریے سے زیادہ گھر کی سیاست کا ہے۔ پاکستان وہ ملک ہے جہاں فلسطین کا سوال کسی خارجہ پالیسی کی فائل میں نہیں، عوام کے دل میں دھڑکتا ہے۔ کوئی حکومت، خواہ سویلین ہو یا غیر سویلین، اِس سوال پر عوام کے سامنے کھڑی نہیں ہو سکتی۔ پاکستان کا اسرائیل کو تسلیم کرنا صرف ایک سفارتی فیصلہ نہیں ہوگا، یہ ایک ایسی چنگاری ہوگی جو پورے ملک کو لپیٹ میں لے سکتی ہے۔ اور اِس کے اوپر کشمیر کا پہلو ہے۔ جس دن پاکستان نے کہا کہ ایک مقبوضہ علاقے کو تسلیم کرنا جائز ہے، اُسی دن اُس کا اپنا کشمیری مقدمہ کمزور ہو جائے گا۔ یہ بات اسلام آباد کا ہر سفارت کار جانتا ہے۔ سو جو یہ رولا یوٹیوبرز اور باخبر لوگوں نے ڈال دیا ہے کہ بس پاکستان معاہدہ ابراہیمی ہر دستخط کرنے لگا ہے، سراسر فریب ہے۔

پاکستان کا جواب پہلے سے لکھا ہوا ہے۔ وہ ''نہ'' کہہ رہا ہے اور کہے گا، مگر زرا سٹائل سے۔ وہ ٹرمپ کو ناراض نہیں کرے گا، کیونکہ پچھلے ایک سال میں اُس نے واشنگٹن کے ساتھ تعلقات بڑی محنت سے سنوارے ہیں۔ وہ امن کا ثالث بنا رہے گا، مگر اِس مخصوص کاغذ سے دور رہے گا۔ یہ پاکستان کی کلاسیکی حکمتِ عملی ہے۔ نہ ہاں، نہ نہ، بس وقت گزاری، جب تک ٹرمپ کی باری ختم اور اگلی باری شروع!!

اور یہی اِس پورے کھیل کا انجام ہے۔ کشنر اور وٹکوف ریاض جائیں گے۔ تصویریں بنیں گی۔ اعلامیے جاری ہوں گے۔ مگر کوئی دستخط نہیں ہوگا۔ سعودی انتظار کرے گا۔ پاکستان انتظار کرے گا۔ اور نیتن یاہو، تل ابیب میں، اُس دباؤ کو محسوس کرتا رہے گا جو بظاہر اُس پر ڈالا ہی نہیں گیا۔

یہ ''لازمی امن'' دراصل ایک تھیٹر ہے، جس میں اداکار اپنے کردار جانتے ہیں، اور ہدایت کار جانتا ہے کہ ڈرامہ کہاں ختم ہوگا۔ عرب اپنا انکار جانتے ہیں۔ پاکستان اپنی مجبوری جانتا ہے۔ اور امریکی صدر، سب سے زیادہ، یہ جانتا ہے کہ یہ کاغذ اِس وقت دستخط نہیں ہوگا۔ مگر وہ یہ شور اِس لیے مچا رہا ہے کہ ایک شخص کو، جو اِس ڈرامے کا اصل ہدف ہے، یاد دلا دے کہ تالے کی چابی اُس کی جیب میں ہے، اور دنیا یہ دیکھ رہی ہے کہ وہ چابی نکالتا ہے یا نہیں۔ اور وہ شخص چابی نہیں نکالے گا۔ کیونکہ چابی نکالنے کی قیمت اُس کی اپنی کرسی اور جان ہے۔

پاکستان یہ گیم سمجھتا ہے۔ ایٹم بم بنانے سے لے کر طالبان، طالبان کھیلنے تک اسی میں مہارت حاصل کی گئی. جب بڑے کھلاڑی ایک دوسرے کے ساتھ کھیل رہے ہوں، تو چھوٹے کھلاڑی کی سب سے بڑی دانش یہ ہے کہ نہ شور میں شامل ہو، نہ دباؤ میں آئے، نہ کسی کے ڈرامے کا حصہ بنے۔ اپنا پاسپورٹ، اپنے ستتر سال پرانے جملے سمیت، ویسے کا ویسا رکھے۔ کیونکہ بعض اوقات سب سے بڑا سفارتی بیان، خاموشی سے کھڑے رہنا ہوتا ہے یا خواجہ آصف کو مٹی جھاڑ کر آگے کر دینا ہے۔

پیش منظر: مرزا محمد الیاس

اور اب بیت المقدس کی باری ہے، نئے نکبہ کی تیاری ہے

اسرائیل کا منصوبہ امریکی سرپرستی اور آئی پیک (AIPAC) کے تعاون سے یہ ہے کہ جہاں بھی فلسطینی آباد ہے، اس کا گھر، بچے بڑے ہیں، وہ نکال دیے جائیں اور وہاں دنیا بھر سے یہودی (Settlers) لا کر آباد کیے جائیں۔ یہ علاقہ خواہ مغربی کنارہ ہو، غزہ ہو، اسرائیل کے اندر کوئی ہو یا بیت المقدس یعنی یہودی اصطلاح میں یروشلم ہو۔ بین الاقوامی انتظام اور اقوام متحدہ کی تقسیم کے مطابق مقبوضہ مشرقی بیت المقدس یا یروشلم کا مشرقی حصہ ہو یا مغربی بیت المقدس ہو، صہیونی یعنی آبادکار یا باہر سے لایا گیا یہودی ہو۔ اور اب تو بیت المقدس کے مشرقی حصہ کی ضرورت ان یہودیوں کو آباد کرنے کے لیے بھی بڑھتی جارہی ہے جن کے تل ابیب، حائفہ سمیت آٹھ شہروں میں ایران سے جنگ میں تباہ ہوئے ہیں۔ اس لیے نئے نکبہ کی ضرورت ہے تاکہ ہر مسلمان یا مسیحی فلسطینی جہاں بھی ہو، اسے مار دیا جائے، نکال دیا جائے، تباہ و برباد کر دیا جائے۔ غزہ میں تجربہ تو اسرائیل کے لیے بہت کارآمد ہے کہ فلسطینی جیسے بھی مار دیا جائے، بے گھر کر دیا جائے، شمال سے جنوب اور وسطی غزہ سے رفاہ کی جانب دھکیل دیا جائے، کوئی مسلمان بے وقوفی کی غیرت کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔

مسجد اقصیٰ کے گرد یہودی حصار قائم کرنے کے ایک منصوبے پر کام کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ مشرقی بیت المقدس کے قریب سلوان (Silwan) فلسطینی آبادی ہے۔ یہ مسجد اقصیٰ کے جنوب کی جانب واقع ہے۔ اسے 2024ء میں فلسطینیوں سے زبردستی چھین لیا گیا تھا۔ ان کے گھر اور دیگر عمارات تباہ کر دی گئی تھیں۔ اس آبادی میں گھروں کی تعداد پچاس کے لگ بھگ تھی۔ یہاں کے ایک رہائشی فخری ابو وہاب نے بتایا کہ میں بچپن میں اس علاقے میں اپنی والدہ کے ساتھ سارے دن کی تھکان کے بعد جب واپس آتا تو ہم کافی پیا کرتے تھے۔ ہم اپنی زمین کی نگرانی کرتے اور اس کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ہم پانچ بہن بھائی تھے۔ پھر صہیونی فوج نے یہ کہہ کر ہمارا گھر مکمل مسمار کر دیا تھا کہ ہمارے پاس وہاں رہائش کا پرمٹ نہیں تھا۔ ہم وہاں گزشتہ 50 برسوں سے مقیم تھے۔ البسطان ہماری آبادی کا نام تھا۔ پھر 2024ء میں ان تمام گھروں کو گرا دیا گیا تھا۔ مسجد الاقصیٰ کے جنوب میں فلسطینی گھر تھے۔ ان کو ایک طے شدہ منصوبے کے تحت مسمار کر دیا گیا۔ ان پر بلڈوزر چلا دیے گئے۔ وہاں کے رہائشی ابو وہاب نے بچپن سے اب تک کی اپنی یادیں تازہ کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے میرا بچپن مجھ سے چھین لیا۔ میری یادیں وہ مجھ سے نہ چھین سکے۔ مجھے اب بھی وہاں سے اپنی ماں کی خوشبو آتی ہے۔

جنوب میں فلسطینی آبادی مسجد اقصیٰ سے بالکل متصل تھی۔ یہاں شمال میں وادی حلوا تھی۔ اسے عام زبان میں (Wadi Hilwi) کہا جاتا تھا۔ درجنوں کی تعداد میں یہاں کے گھروں کو مسمار کر کے یہودی بستی آباد کر دی گئی۔ اس طرح یہاں کے مکینوں کی مسجد اقصیٰ

تک رسائی مشکل بنادی گئی۔ جب فلسطینی اب یہاں سے گزرنے کی کوشش کرتے ہیں تو آبادکار یہودی ان پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

ایتان دراصل سلوان کے تین حصوں میں سے ایک ہے۔ بسطان فلسطینی ڈسٹرکٹ ہے۔ بیت المقدس کے پرانے شہر میں یہ ڈسٹرکٹ مسجد اقصیٰ کی جنوبی دیواروں کے ساتھ ساتھ واقع ہے۔ فلسطینی یہاں اسرائیل کے قیام سے پہلے سے آباد ہیں۔ وہ پرانے شہر کے رہائشی یا باشندے ہیں۔ پرانے شہر کے شمال کی طرف جائیں تو اس طرف بہت عرصے سے یہودی بستی بتدریج تعمیر کی گئی ہے۔ اب یہ ایک بڑی بستی ہے۔ یہاں سے ہر فلسطینی گھر، زرعی اراضی اور کاروبار تباہ کردیے گئے ہیں۔ اب یہاں صرف آبادکار یہودی آباد ہیں۔

یہاں یہودی آبادکار بستی کے مکمل ہونے میں تاخیر کی وجہ یہ رہی کہ فلسطینی اپنے گھروں کی تباہی کے باوجود وہاں سال ہا سال موجود رہے اور نکالے جانے کے خلاف مزاحمت کرتے رہے۔ یہاں اقوام متحدہ کے عمل دخل نے بھی بستی کی تعمیر میں رکاوٹ پیدا کیے رکھی۔ اس بستی شیخ جرہ کے ساتھ ہی راس العمود پرانے شہر کے جنوب مشرق میں یہودی آبادکاروں کی سرگرمیوں کا بڑا علاقہ رہا۔ ان کی حفاظت کے لیے بھاری تعداد میں صہیونی فوج تعینات کی گئی۔ اس طرح اسرائیلی حکومت کی سرپرستی رہی اور آبادکار یہودی بستیوں کی تنظیمیں اب بھی کام کررہی ہیں۔

غزہ میں اکتوبر 2023ء سے شروع ہونے والی نسل کشی نے بھی اثرات مرتب کیے۔ مقبوضہ بیت المقدس کے مشرقی حصہ میں فلسطینی گھروں اور عمارتوں کو گرانے کا سلسلہ تیز کردیا گیا۔ غزہ کی صورت حال پر عالمی توجہ نے مقبوضہ مشرقی بیت المقدس میں اسرائیلی کاروائیوں کو نگاہوں سے قدرے اوجھل کیے رکھا۔ اس دوران میں فلسطینی آبادی کو ان علاقوں سے بے دخل کرنے اور ان کی املاک تباہ کرنے کی مہم میں تیزی لائی گئی۔ اس کام کی نگرانی قومی سلامتی کے انتہاپسند وزیر اتمار بن غفیر کرتے رہے۔ اس مہم میں ایستان میں بڑے پیمانے پر کارروائیاں کی جاتی رہیں۔ ان کارروائیوں کے خلاف احتجاج کو تشدد سے جوڑ دیا جاتا رہا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ان اور دیگر علاقوں میں 20 ہزار گھر تباہ کیے گئے اور فلسطینیوں کو بے دخل کرکے کہیں مستقل آباد ہونے نہیں دیا جاتا۔ وہ جہاں جاتے ان سے رہائشی پرمٹ طلب کیے جاتے جو ان کے پاس نہ ہوتے کیوں کہ وہ اپنے اپنے علاقوں سے پہلے ہی بے دخل کیے جاتے رہے۔ ان پر تشدد کارروائیوں سے عالمی اداروں نے بوجوہ لاعلمی اور لاتعلقی کے رویوں کا مظاہرہ کیا۔ اسرائیل کی ان علاقوں میں سرگرمیاں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں۔

اسرائیل نے مسجد اقصیٰ کے پڑوس کا نقشہ ہی تبدیل کردیا۔ آبادکار یہودیوں کی بستیوں میں اس طرح اضافہ ہوتا رہا جیسے کہیں مش روم کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اسرائیل نے یہاں بڑی تعداد میں بائبل تھیم پارک بنائے۔ فلسطینی آبادی کو الگ تھلگ کردیا گیا۔ اب مسجد الاقصیٰ کے اردگرد تباہی کو ایک نگاہ میں ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ اب یہاں تنگ و تاریک گلیاں، مٹی کے ڈھیر اور تباہ کیے گئے گھروں کا ملبہ ہی ہر طرف پھیلا نظر آتا ہے۔ فلسطینی اس تباہی میں بھی اپنے گھروں کے حدود اربعہ کو یاد کرکے غم زدہ ہوجاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تباہی محض ہمارے گھروں کی نہیں ہے بل کہ ہماری پوری تہذیب اور تاریخ تباہ کی جارہی ہے۔ ہمارے بچپن ہم سے چھینے جارہے ہیں۔

البسطان کی مکمل تباہی:

السلوان میں فلسطینیوں نے بڑے منصوبے کے تحت مسجد اقصیٰ کے قرب و جوار اور وہیں اپنے گھروں کی تباہی کا مشاہدہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنے گھروں کے خاتمے اور یہودی بستیوں کی جبری تعمیر کو بھی دیکھا ہے۔ وہ یہ سلسلہ 1967ء کی جنگ سے ہی دیکھتے آئے ہیں۔ اب اس تباہی میں بہت تیزی سے اضافہ ہوگیا ہے۔

اگر ماضی قریب کو دیکھا جائے تو محض چار سال پہلے 2022ء میں تباہی کا آغاز ہوا تھا۔ یہاں 55 ہزار فلسطینی آباد تھے۔ ان کے ڈسٹرکٹ میں 12 علاقے تھے۔ یہ سلسلہ اوروں وادی کی صورت میں 600 ایکڑوں سے بھی زیادہ علاقے پر پھیلا ہوا تھا۔ ماؤنٹ آف اولو (Mount of Olive) ان علاقوں کا مرکز تھا۔ اس کے علاقوں میں وادی حلوہ، البسطان، بطن الجواہ برسوں سے نہیں، عشروں سے آباد تھے۔ اسرائیل نے منظم طریقے سے مکانات گرائے جانے، فلسطینی حق ملکیت کو یہودیوں کو منتقل کرنے، یہودیوں کے لیے بڑے بڑے لان بنانے سے سارا کچھ تبدیل کرکے رکھ دیا۔

2000ء سے فلسطینی مستقل طور پر بے دخل کیے جانے کے خوف میں مبتلا رکھے گئے۔ آبادکار یہودی اشارہ کرتے کہ فلاں گھر، عمارت، زرعی اراضی یا کاروبار ان کی ملکیت ہے یا ان کے پاس ہونا چاہیے، اسرائیلی حکام وہاں پر آکر پرمٹ طلب کرتے اور نہ ہونے پر بلڈوزر چلا دیتے۔ بائبلی تھیم پارک بنائے جاتے جو جلد ہی یہودی بستی میں تبدیل کردیے جاتے۔ لوگوں کو محسوس ہونے لگا تھا کہ ان کی پوری آبادی صفحۂ ہستی سے صاف کردی جائے گی اور یہودیوں کے لیے گھر تعمیر ہوتے جائیں گے۔

بیت المقدس (یروشلم) امور کے تحقیق دان زیاد ابھیس کے مطابق اسرائیلی حکام نے سلوان میں ان کے علم کے مطابق 2006ء سے 2026ء کے درمیانی عرصہ میں کم از کم 25 فلسطینی گھروں کو بلڈوز کیا ہے۔ یہ تعداد ہر سال کے اعتبار سے ہے۔ اس طرح 2026ء تک 600 سے زیادہ گھر گرائے گئے ہیں۔ مقامی آبادی اور ریسرچرز کا کہنا ہے کہ البسطان کے علاقے میں 54 گھر گرائے گئے ہیں۔ دوسرے علاقوں میں مسجد اقصیٰ کے اردگرد مسمار کیے گئے گھروں کی تعداد 115 ہے۔ جو مکانات باقی رہ گئے ہیں، انہیں نوٹس جاری کیے گئے ہیں کہ گھر بنانے کے پرمٹ دکھائیں ورنہ ان کے گھر مسمار کردیے جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سارے گھر تب سے بنے ہوئے ہیں جب یہاں کسی نوعیت کے پرمٹ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

ان علاقوں میں میونسپل حکام کے کام کی رفتار بہت تیز ہے۔ یہ مکانات بہت جارحانہ انداز میں گرائے جارہے ہیں۔ غزہ میں یہ کام بمباری سے کیا گیا۔ یہاں یہ کام ہر گھر کو بلڈوز کرکے کیا جارہا ہے۔ ان گھروں کے رہائشیوں کو کہا گیا ہے کہ وہ گھروں کو دی گئی تاریخوں سے پہلے مسمار کرکے چلے جائیں ورنہ ان کو بلڈوز کردیا جائے گا۔ یہ نوٹس زیادہ تر زبانی دیے جاتے ہیں اور کوئی تحریر نہیں دی جاتی۔ اگر مقررہ تاریخ تک عمل نہ کیا جائے تو مکانوں کو گرانے کے معاوضے کے ساتھ ساتھ جرمانے بھی کیے جاتے ہیں۔ لیکن مقامی آبادی کچھ عرصہ بے گھر رہنے کے بعد تباہ شدہ گھروں کے ملبے پر آکر بیٹھ جاتی ہے۔ اس طرح وہ قبضہ چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ جب یہودی بستیاں آباد کی جاتی ہیں تو آبادکار یہودی فوج کے ساتھ مل کر جان لیوا حملے کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

یہاں کے فلسطینی کہتے ہیں کہ وہ ہر ہفتے واپس آتے رہتے ہیں۔ اس دوران میں مزید گھر گرائے جاچکے ہوتے ہیں۔ یہودی آبادیوں کے حصار میں آباد ہونے کے لیے چلے جاتے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ تباہ کن صورت حال ہے۔ Ir Amin تنظیم کے کارکن کہتے ہیں کہ یہ تباہی مسلسل ہے۔ سلوان کے رہائشی گزشتہ 20 سالوں سے اپنے

گھروں کی حفاظت کر رہے ہیں۔ اگر گھر مسمار کر دیا جائے تو وہ اس کے ملبے پر بیٹھ جاتے ہیں اور یہودی قبضے کی مزاحمت کرتے ہیں۔ لیکن اب انہیں یوں محسوس ہو رہا ہے کہ ان کی واپسی صہیونی فوج کی کارروائیوں کی وجہ سے اب بہت مشکل تر ہوتی جا رہی ہے۔

بائبل پارکس:

یہاں اس فرق کو واضح کرنا ضروری ہے کہ انجیل مقدس اب کہیں موجود نہیں ہے۔ بائبل انجیل کا انگریزی ترجمہ تو ہو سکتا ہے لیکن یہ انجیل مقدس ہرگز نہیں ہے۔

تاتارسکی کے مطابق مکانات گرانے کا عمل زوروں سے جاری ہے۔ البسطان میں یہ کام منظم طریقے سے ہو رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک عمارت کسی ایک جگہ مسمار کر دی اور دوسری عمارت کہیں دور یا فاصلے پر گرا دی۔ اس ساری کارروائی کا اصل ہدف مسجد اقصیٰ کے حصار یا گھراؤ مکمل کرنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں 1500 فلسطینی آبادی جو محض 15 منٹ کی کال پر مسجد اقصیٰ پہنچ جاتے ہیں۔ یہ بہت اہم جگہ پر مقیم ہیں۔ یہ وادی حلوہ سے شمال کی سمت آباد ہیں۔ دوسرے ان کے مقامات مغرب تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مشرق کی سمت وادی حلوہ اور اس کے قریب 2500 آبادکار یہودیوں کی کالونی بنا دی گئی ہے۔ ان کی حفاظت ہر وقت اسرائیلی فوج اور دوسرے ادارے کرتے ہیں۔ ان کے لیے بھی خصوصی کمپاؤنڈ تعمیر کیے گئے ہیں۔

جب یہاں آباد فلسطینیوں کو منظم طریقے سے ہٹایا جا رہا ہے تو نا آتارسکی کا کہنا ہے کہ یہاں آبادکار یہودیوں کے لیے تعمیر کی گئی کالونی کو بیت المقدس (یروشلم) سے جوڑنا آسان ہو جاتا ہے۔ ان کو گرین لائن سے بھی قربت مل جاتی ہے جب کہ یہاں سے آہستہ آہستہ فلسطینی آبادی کا صفایا ہو رہا ہے۔ گرین لائن 1949ء میں کھینچی گئی تھی اور اسے بھاری ہتھیاروں سے نگرانی میں رکھا گیا تھا۔ اس طرح یہ علاقہ مغربی بیت المقدس کو مقبوضہ مشرقی بیت المقدس سے الگ کر دیتا ہے۔

اگر البسطان کو فلسطینی آبادی سے مکمل خالی کرا لیا جاتا ہے تو مغربی بیت المقدس کا بہت بڑا حصہ سلوان کے اندر تعمیر کی گئیں یہودی بستیوں سے مل جاتا ہے۔ آبادکار یہودیوں کی تنظیموں کو بہت مدد مل جاتی ہے کہ وہ سلوان کو آسانی سے مغربی بیت المقدس کا حصہ بنا دیتی ہیں۔ گویا مسجد اقصیٰ کے قرب و جوار سے فلسطینیوں کو بے دخل کر کے آبادکار یہودیوں کو آباد کیا جا رہا ہے۔ اس بارے میں تاتارسکی کا کہنا ہے کہ اگر اسرائیل یہاں یہ سب کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور لوگ مغربی بیت المقدس سے البسطان میں آباد کر دیے جاتے ہیں جو یہودی ہوتے ہیں تو آسانی سے یہ کام ہو جاتا ہے کہ مغربی بیت المقدس کا علاقہ بڑھ جاتا ہے اور مقبوضہ مشرقی بیت المقدس جو فلسطینی مسلمان کا حصہ ہے، بہت کم رہ جاتا ہے۔ یوں یہ بائبل کی تاریخ کے مطابق (یاد رہے کہ انجیل کے مطابق نہیں) مغربی بیت المقدس بن جاتا ہے جو یہودیوں کی اکثریت کا علاقہ ہے۔ چناں چہ سلوان میں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور ان تبدیلیوں کا مرکز البسطان ہے جو مسجد کے قریب ترین ہے۔ یہاں یہودیوں کے سوا کوئی اور نہیں رہنے دیا جاتا۔

البسطان میں توڑ پھوڑ، فلسطینی گھروں اور ان کی دیگر عمارات کی تباہی کو یہ کہہ کر جائز قرار دے دیا جاتا ہے کہ یہاں رہنے والے فلسطینیوں کے گھروں کے لیے پرمٹ حاصل نہیں کیے گئے اس لیے یہ گھر اور عمارات ناجائز ہیں۔ ان گھروں کو یروشلم میونسپلٹی اسی جواز پر توڑنا شروع کر دیتی ہے۔ جہاں تک پرمٹ کی بات ہے تو اس کا حاصل کرنا تقریباً ناممکن بنا دیا گیا ہے۔

اس صورت حال پر نظر رکھنے والے مبصرین کہتے ہیں کہ مکانات اور دیگر عمارتیں میونسپل حکام کی منصوبہ بندی کے خلاف قرار دے کر اور یہاں پر ماحولیاتی اصولوں کی خلاف ورزی کہہ کر سب کچھ تباہ کیا جا رہا ہے جب کہ انہیں مقامات پر بنائی گئی یہودی بستیوں پر یہ اصول اور قوانین کیوں لاگو نہیں ہوتے۔ اس طرح مسجد اقصیٰ کے اردگرد فلسطینی آبادیوں کو ختم کیا جا رہا ہے اور فلسطینی بے دخل کیے جا رہے ہیں۔

اسرائیل کے اخبار حارتز کے مطابق ان گھروں کی منظم تباہی اب کسی حد تک روک دی گئی ہے کیوں کہ اپنی جائیدادوں کی تباہی کے خوف نے یہاں کے فلسطینیوں کو ان کو آبادکار یہودیوں کو اونے پونے داموں میں فروخت کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہاں خوف و ہراس کی فضا قائم کی گئی ہے۔

انہی علاقوں میں یہودی بستیاں تعمیر کی جا رہی ہیں اور ان کو ہر طرح کی شہری سہولتیں دی جا رہی ہیں۔ ان کو درجہ اول کے شہری قرار دیا جا رہا ہے۔ ان کے لیے یہاں یہودی معبد، ریستوران اور سیاحتی مراکز تعمیر کے جا رہے ہیں۔ یہ سب طے شدہ پلاننگ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کیا جا رہا ہے۔

یہاں مکانات اور دیگر عمارتوں کو مسمار کرنے اور فلسطینی آبادی کو بے دخل کرنے کا ہدف یہ ہے کہ یہودی آثار قدیمہ کے مطابق پارک تعمیر کیے جائیں۔ ان کو کنگز گارڈن قرار دیا جاتا ہے۔ پھر ان کو شہر داؤد یا داؤد سٹی سے ملایا جا رہا ہے۔ یہ سیاحتی مقام میں تبدیل کیا جائے گا یہ ایک سلسلہ ہے۔ یہاں کے حقوق ملکیت کسی کے پاس نہیں ہیں۔ میونسپل اتھارٹی کو یہ

سارے حقوق حاصل ہیں۔ ان پر کسی کو تنازعہ کھڑا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہاں کا کوئی معاملہ کسی بھی عدالت میں نہیں لے جایا جاتا اور نہ جانے دیا جاتا ہے۔ یہاں جو احکامات دیے جاتے ہیں، وہ بھی کسی بھی فورم پر اٹھائے یا چیلنج نہیں کیے جاتے۔ یہاں چھینی گئی فلسطینی زمین پر پارکس بنائے جاتے ہیں اور ان کو بائبل پارکس کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے لیے صہیونیت کے طے کردہ قانون نافذ کیے جاتے ہیں۔

چناں چہ بائبل پارک کی تعمیر کے لیے مکانوں پر بھاری بلڈوزر چلا دیے جاتے ہیں۔ اگر مکین مزاحمت کرنا چاہیں یا کریں تو ان کے گھر ان کے سامان سمیت تباہ کر دیے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کو مسجد اقصیٰ کے پڑوسی ہونے کی سزا دی جا رہی ہے۔ فلسطینی زمین کے مالکان پر قوانین لاگو کیے جاتے ہیں۔ جب یہ عمل مکمل ہوتا ہے تو دو کام کیے جاتے ہیں۔ پہلا کام یہ ہے کہ مغربی بیت المقدس کے یہودیوں کو لا کر یہاں آباد کر دیا جاتا ہے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ بیرون اسرائیل سے لائے گئے غیر ملکی یہودیوں کو لایا جاتا ہے، ان کی بستیاں بسائی جاتی ہیں۔

جب یہ مراحل طے ہو جاتے ہیں تو اسرائیل میں سلامتی کے وزیر اتمار بن غفیر ان یہودیوں کے گروہ لے کر مسجد اقصیٰ میں دندناتے ہیں۔ مسجد کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ فوج، پولیس اور دوسرے ادارے فلسطینیوں کو مسجد جانے سے روکتے ہیں۔ ان پر تشدد کیا جاتا ہے۔

اسرائیل مقبوضہ مشرقی بیت المقدس کی ہیئت میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کا بین الاقوامی قانون کے تحت کسی طرح بھی مجاز نہیں ہے۔ اس کے لیے یہ قوانین کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ مقبوضہ مشرقی بیت المقدس مسلمانوں کا علاقہ ہے۔ اب یہاں 2 لاکھ 33 ہزار یہودی لا کر بسائے گئے ہیں۔ مقبوضہ مغربی کنارے میں یہودیوں کی تعداد 5 لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے جب کہ بین الاقوامی قانون کو پامال کیے بغیر کوئی تبدیلی یا آبادکاری کا کوئی حق اسرائیل کو حاصل نہیں ہے۔ ان یہودیوں کے لیے بستیاں بنائی جا رہی ہیں۔ ان مسجد ان کے اب مکمل حصار میں ہے۔

نیا نکبہ:

ان علاقوں میں دو بڑی صہیونی تنظیمیں سرگرم ہیں۔ ان میں سے ایک Ateret Cohanim ہے۔ یہ 1978ء میں قائم کی گئی تھی۔ دوسری صہیونی تنظیم (Elad) ہے۔ یہ 1986ء میں بنائی گئی تھی۔ یہ دونوں تنظیمیں Non-Profit آرگنائزیشنز کے طور پر رجسٹرڈ ہیں۔ ان کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ یہ اسرائیلی حکومت کی سرپرستی میں کام کر رہی ہیں۔ ان کو اسرائیلی پارلیمنٹ میں سیاسی حمایت بھی حاصل ہے۔ مختلف ادارے ان کو فنڈز بھی دیتے ہیں اور لاجسٹک سپورٹ بھی فراہم کرتے ہیں۔

یہ دونوں گروہ برسوں سے سلوان سے فلسطینیوں کو بے دخل کرنے، ان کی جائیدادوں اور گھروں پر قبضہ کرنے کا کام کرتی ہیں۔ قابض فوج ان کی مدد کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلسطینی گھر تو دراصل یہودیوں کے تھے، جن پر قبضہ کر لیا گیا۔ اس طرح کے جواز بنا کر فلسطینی جائیدادوں پر قبضہ کر لیا جاتا ہے۔

فلسطینی آبادی بار بار مزاحمت کرتی ہے تاکہ اپنی جائیدادوں پر قبضے کو روک سکیں، یہودی بستیاں بنانے کے خلاف جدوجہد کرتی رہیں۔ ان کا آبادکار یہودیوں سے تصادم ہوتا رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فلسطینی اسرائیلی عدالتوں میں مقدمات بھی دائر کرتے ہیں، ان دونوں آرگنائزیشنز کے اقدامات کے خلاف حتی المقدور مزاحمت بھی کرتے ہیں، حکومتی ہتھکنڈوں کا سامنا بھی کرتے ہیں۔ ان تمام کوششوں کے باوجود مقبوضہ مشرقی بیت المقدس میں یہودیوں کی تعداد میں اضافہ اور فلسطینی مسلمانوں کی بے دخلی کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح مسجد اقصیٰ کو آئے روز الگ تھلگ کیا جا رہا ہے۔

فلسطینیوں نے اپنے نمائندے زیاد کے توسط سے میونسپلٹی سے درخواست میں کہا کہ کسی بھی اقدام سے پہلے ہم سے مذاکرات کیے جائیں۔ میونسپلٹی حکام نے پہلے تجویز سے اتفاق کیا۔ جب مذاکرات شروع ہوئے تو حکام نے شرکت جاری رکھنے سے انکار کر دیا۔ یہ واقعہ فروری میں پیش آیا اور مکانات کے مالکان سے کہا کہ منصوبے کے تحت مسماری کا کام جاری رہے گا۔ ساری آبادی کسی اور جگہ رہنے کا انتظام کرے۔

ابو وہاب کا کہنا ہے کہ بہت سے مکانات گرائے جا چکے ہیں۔ بے دخل ہونے والے فلسطینی جب اپنے عزیز و اقارب کے پاس گئے تو ان کے مکانات پر بھی بلڈوزر پھیر دیا گیا۔ کچھ نے بیت المقدس میں کرائے کے گھر لے کر رہنے کا انتظام کیا۔ لیکن سب کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ بڑھتے کرایوں کا بوجھ اٹھا سکیں۔ وہ کھلے آسمان تلے ٹینٹ لگا کر اسی طرح رہنے پر مجبور ہیں جس طرح غزہ میں ٹینٹ کالونیاں بنا کر لوگ رہ رہے ہیں۔ یہ علاقہ اب گھروں کے نہ ہونے کے بحران کا سامنا کر رہا ہے۔

اصل منصوبہ یہی ہے کہ فلسطینی آبادی کو ان کی اصل زمین سے نکال کر دوسری جگہ جانے پر مجبور کر دیا جائے۔ اگر اسرائیل سلوان پر مکمل قابض ہو جاتا ہے تو حالات نہایت سنگین صورت اختیار کر لیں گے۔ یہ ایک نئے نکبہ کا آغاز ہے۔

جائزہ: ابوالعین

مسجد اقصٰی: کسی ہیکل پر تعمیر نہیں کی گئی

قبلۂ اول مسجد الاقصیٰ سے مسلمانوں کی حالیہ بے داری نے فلسطینی عوام اور مسجد کے آئمہ کرام کو اس قدر مضطرب کر دیا ہے کہ وہ مغرب سے اپیل کر رہے ہیں کہ اسرائیل کو اس کے موجودہ رویوں سے باز رکھا جائے۔

مسجد الاقصیٰ کے اسلامی وقف کے نائب سربراہ مصطفیٰ ابوسوے نے مسجد کو بار بار بند رکھنے اور اب مختصر اوقات میں کھولنے سے روکنے کے لیے اپیل کی ہے۔ ایک اعلیٰ رکن اسلامی وقف انتظامیہ کے طور پر مصطفیٰ نے مغربی حکومتوں سے کہا ہے کہ اسرائیل مسجد کے معاملات میں مسلسل مداخلت سے آگ سے کھیل رہا ہے۔ وہ نہ صرف فلسطینی مسلمانوں بل کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات مشتعل کر رہا ہے۔ وہ اپنے قبلۂ اول کی حفاظت سے صرف اس لیے محروم ہیں کیوں کہ ان کی حکومتیں انہیں بے بس رکھے ہوئے ہیں۔ اسلامی وقف نے کہا ہے کہ اسرائیل سے کہا جائے کہ وہ بیت المقدس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ سے باز رہے۔ مصطفیٰ ابوسوے کا مطالبہ وارننگ کے طور پر سامنے آیا ہے۔ اس میں صاف الفاظ میں انہوں نے کہا ہے کہ مسجد اقصیٰ پر قبضے اور اس کی ہیئت تبدیل کرنے اور اس کی جگہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی اجازت نہیں دی جا سکتی، یہ ہیکل کی جگہ نہیں ہے۔ اسرائیل مسجد کی حیثیت اور مقام دونوں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے قومی سلامتی کے وزیر اتمار بن غفیر کے بیانات اور مسجد میں آباد کار یہودیوں کے غول در غول لے کر وہ اپنے سیاسی مقاصد کے لیے کام کر رہا ہے۔ اسے یہودیوں کے مفادات سے بھی کوئی غرض نہیں ہے۔ مسجد کے نیچے کی جانے والی کھدائی سے بھی کسی ہیکل کے نشان تک نہیں ملے ہیں۔

اتمار بن غفیر نے پورے رمضان المبارک سمیت چالیس روز تک مسجد کے دروازے مسلمانوں پر بند رکھے ہیں۔ انہیں جمعہ کے اجتماعات مسجد کے باہر ادا کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ ان اجتماعات میں ہزاروں مسلمانوں نے شرکت کی ہے۔ انہیں رمضان کے آخری عشرے میں لیلۃ القدر کی تلاش اور عبادات سے محروم رکھا گیا ہے۔

اسلامی وقف کے نائب سربراہ مصطفیٰ نے کہا ہے کہ ان اقدامات سے یہ سارا خطہ عدم استحکام کا شکار ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ”اگر ہم اس خطے کے استحکام کی بات کر رہے ہیں اور اس کے عدم استحکام سے دوچار ہونے کا کہہ رہے ہیں، مغرب کی جملہ حکومتوں کو اس جانب توجہ دینا چاہیے۔ وہ اسرائیل کو خبردار کریں کہ یہ معاملہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس لیے اتمار بن غفیر وزیر اعظم نیتن یاہو کے ساتھ مل کر اقدامات کر رہا ہے تو اس سے پورا خطہ آگ کی لپیٹ میں آ سکتا ہے۔ اس سے اسرائیل کو ہم صاف الفاظ میں پیغام دے رہے ہیں کہ ان اقدامات سے باز رہا جائے۔“ دوسری طرف فلسطینی مسلمانوں میں مایوسی بڑھ رہی ہے۔ وہ اس بات کو سمجھ رہے ہیں کہ مغربی حکومتوں کے دوھرے مفادات انہیں صحیح فیصلہ اور راست اقدام سے روکے ہوئے ہیں۔ ایک ہفتہ قبل امریکہ، اٹلی، سپین، دی ویٹی کن اور دوسرے ممالک پر تنقید کی تھی کہ وہ بیت المقدس کے مسیحیوں کو پاک سنڈے کی تقریبات بڑے چرچ میں ادا کرنے سے روک رہا تھا۔ ان کی تنقید کا نیتن یاہو نے سخت ترین لہجے میں جواب دیا تھا۔ دوسری طرف پورے مغرب نے 40 دن تک مسلمانوں کے لیے مسجد اقصیٰ کی بندش پر مجرمانہ انداز میں خاموشی اختیار کیے رکھی۔

اردن کی پارلیمنٹ کے ایک رکن صالح الرموطی نے اسلامی ایکشن فرنٹ کی نمائندگی کرتے ہوئے ویٹی کن کی طرف سے اسرائیل کی مذمت کو بڑے چرچ کی بندش پر

مذمت کو جرأت مند بیان قرار دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں پوپ سے کہتا ہوں کہ وہ مسجد کو مستقل طور پر مسلمانوں کے لیے کھلے رکھنے کے لیے زور دیں۔

اسرائیل نے 28 فروری کو مسجد اقصیٰ کو اس وقت بند کر دیا تھا جب اس نے امریکہ سے مل کر ایران پر حملہ کیا تھا۔ اس بندش کو سیکیورٹی وجوہات سے جوڑا تھا۔ مسجد اقصیٰ بیت المقدس کے قدیم حصے میں ہے اور یہاں دیگر مذاہب کے عبادت کرنے کے مقامات بھی ہیں۔ مسیحیوں کا یہاں چرچ Charch of Holy Sepulcrse اور یہودیوں کی عبادت کی ویسٹرن وال یعنی دیوار گریہ موجود ہیں۔ ان مقامات کو وقتاً فوقتاً کھولا جاتا رہا ہے جب کہ مسجد اقصیٰ کو مستقل طور پر بند رکھا گیا۔

فروری کے آخر میں جنگ کے آغاز اور مسجد کی بندش سے پہلے امام شیخ محمد العباسی کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کو مسجد کے اندر ہی ایک مقام پر نظر بند رکھا گیا۔ اس دوران میں اردن اور کچھ دیگر مسلم ممالک اسرائیل سے کہتے رہے کہ وہ مسلمانوں کو مسجد کے اندر عبادت کرنے کی اجازت دے۔ مارچ کے آغاز پر آٹھ مسلم ممالک نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا جس میں اسرائیل کی طرف سے مسلم زائرین پر بے جا پابندیوں کی بلا جواز قرار دیا گیا اور ان کی مذمت کی گئی تھی۔ اس مشترکہ بیان میں کہا گیا تھا کہ یہ پابندیاں بین الاقوامی قوانین کا مذاق اڑانے کے مترادف ہیں۔ اپنی عبادت گاہوں تک ہر کسی کو رسائی دینے کے حق کی بھی خلاف ورزی ہیں۔

بیت المقدس میں مسیحی اور یہودی عبادت گاہوں کے مقابلے میں صورت حال جوں کی توں رکھی گئی جب کہ دیگر مذاہب والوں کو ان کی عبادات کے اوقات میں اپنی عبادت گاہوں میں جانے اور عبادات کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس طرح اسرائیل نے مغربی حکومتوں کو خاموش کیے رکھا۔

اسرائیل نے 1967ء میں بیت المقدس کے پرانے شہر پر قبضہ کیا تھا۔ اس نے اس وقت کی صورت حال کو قبلہ اول کے معاملے میں جوں کا توں رکھا تھا۔ گویا وہاں ایک طرح سے سٹیٹس کو تھا، اسلامی وقف نے واضح کیا کہ اسرائیل کو مسجد اقصیٰ کے معاملات میں مداخلت یا انہیں تبدیل کرنے کا کوئی بھی استحقاق حاصل نہیں ہے۔ اس بارے اقوام متحدہ کی قراردادیں بھی موجود ہیں۔ مسجد کے انتظامات کی ذمہ داری اقوام متحدہ نے اردن کی وزارت اوقاف اور اسلامی امور کے سپرد کر رکھی ہے۔ اس کے علاوہ کسی کو، حتیٰ کہ اتمار بن غفیر کو بھی مداخلت کا ذرہ بھی حق نہیں ہے۔ وہ مسجد میں داخلے کے اوقات مقرر کرنے کے بھی مجاز نہیں ہیں۔ مسجد کو دو حصوں میں تبدیل کرنے کے اقدامات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اسرائیلی حکام ان طے شدہ اصولوں کی مسلسل خلاف ورزی اور قبلہ اول کی پامالی کرتے ہیں۔

قبلہ اول ہر وقت اسرائیلی فوج اور پولیس کے سخت حصار میں رہتا ہے۔ اس کا کوئی بھی قانونی یا اخلاقی جواز نہیں ہے۔ مسجد جانے والے فلسطینیوں کو زبردستی روکا جاتا ہے، ان پر تشدد کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات انہیں گنبد اطلس سے بھی پرے دھکیل دیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ گنبد اطلس وہ مقام ہے جہاں سے نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تھے۔

اسرائیلی فوج اور پولیس کے روکنے کے باوجود جمعہ اور عیدین کے اجتماعات مسجد اقصیٰ اور گنبد اطلس سے شروع ہوتے ہیں اور دور دور تک مسلمان وہاں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ مسلم خواتین بھی ایک طرف عبادات میں مصروف ہوتی ہیں۔

اسرائیل کو مسجد کے امور میں مداخلت کا موقع حکومت اردن کی مسلسل اور مکمل خاموشی سے ملتا ہے۔ اردنی حکومت اپنی وزارت کے ذریعے رسمی بیانات جاری کرتی ہے۔ اسرائیل کے علم میں ہے کہ ان بیانات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ان کے برعکس اقدامات پر بھی اردن خاموش ہی رہے گا۔

اسرائیلی پولیس مسجد اقصیٰ کے اندر کام کرنے والے افراد اور خدام کو بھی ہراساں کرتی ہے۔ ان کے مسجد میں داخلے پر پابندی لگا دیتی ہے۔ مسجد کے ان خدام کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے۔ ان میں سے صرف 25 افراد کو اندر داخلے کی اجازت دیتی ہے۔ اس سے خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ اسرائیل مسجد کے اندر اپنی مرضی سے تبدیلیاں کر سکتا ہے۔ کئی بار مسجد کے قالین جلائے گئے ہیں۔ اس کے داخلی راستوں کی توڑ پھوڑ کی گئی ہے۔

جب یہودی مسجد میں داخل کیے جاتے ہیں تو انہیں مسجد میں ہر طرف جانے کی اجازت دی جاتی ہے۔ وہ کئی مواقع پر مسجد کے اندر کام کرنے والے مسلم خدام پر تشدد کے بھی مرتکب ہوئے لیکن ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اسرائیلی کے ربی بار بار یہ کہہ چکے ہیں کہ یہودیوں کو مسجد اقصیٰ میں داخلے یا وہاں عبادت کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ بات اسرائیل کے چیف ربی بھی کئی بار کہہ چکے ہیں۔ اس کے برعکس عام یہودی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انہیں مسجد کے صحن میں بیٹھے رہنے اور عبادات کرنے کا حق حاصل ہے۔

وہ اس خیال سے بیٹھتے ہیں کہ قدیم زمانے میں یہیں ان کے ٹمپل تھے جنہیں گرا کر مسجد تعمیر کی گئی تھی۔ تاریخ ان دعووں کی نفی کرتی ہے۔ ان کے ٹمپل کو نہ تو کبھی مسلمانوں نے گرایا اور نہ ہی مسجد کسی طرح سے تیسرے ہیکل کے قریب یا اسے گرا کر بنائی گئی ہے۔

اتمار بن غفیر کا دعویٰ: مسجد الاقصیٰ میری ملکیت ہے

فلسطین کے اداروں نے اسرائیل اور بالخصوص اتمار بن بن گویر (غفیر) کو خبردار کیا ہے کہ وہ قبلۂ اول کو تقسیم کرنے باز رہیں۔ ایسا کیا گیا تو اسرائیلی انتظامیہ، یروشلم گورنریٹ اور اتمار بن غفیر کے لیے اس کے نتائج تباہ کن ہوں گے۔ ایک اور منصوبہ یہ ہے کہ ایک وقت میں جس تعداد میں یہودی (مقامی اور آبادکار) مسجد الاقصیٰ میں داخل ہوں اتنی ہی تعداد میں مسلمانوں کو داخلے کی اجازت دی جائے۔ ایک اور منصوبہ یہ ہے کہ مستقل طور پر مسجد کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس پر یہ سوال بھی اٹھایا گیا ہے کہ یہودیوں کے سنا گاگ (معبد اعلیٰ) میں بھی وقت تقسیم کر کے ایک برابر تعداد میں یہودیوں اور مسلمانوں یعنی فلسطینیوں کو داخلے کی اجازت دی جائے۔ کیا اسرائیلی حکومت اور عوام اس تقسیم پر رضامند ہو جائیں گے؟

اسرائیل کے سلامتی کے وزیر اتمار بن غفیر نے مسجد اقصیٰ پر ہلہ بول دیا۔ وہ اپنے ساتھ آبادکار یہودی اور بھاری تعداد میں پولیس لے کر جوتوں سمیت دندناتے ہوئے داخل ہوئے تھے۔ اس سے پہلے یہ کام بدنام زمانہ اور کومے میں طویل عرصہ مبتلا ہونے والے ایریل شیرون نے اپنی وزارت کے دوران کیا تھا۔ اس کا ردعمل کہ فلسطینی انتفادہ کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔

اس مرتبہ پورے 40 دن بشمول رمضان المبارک مسجد الاقصیٰ کو بند رکھا گیا تھا۔ نماز فجر کے علاوہ عید الفطر کی نماز بھی ادا کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ اب اتمار بن غفیر نے کہا ہے کہ مسجد میں داخلے کے اوقات طے کیے جا رہے ہیں۔ یہ مسجد میری ملکیت ہے، میں اس میں جو اور جس طرح چاہوں، کروں گا۔ اس مرتبہ جب مسجد کو کھولا گیا تو پہلے مرحلے میں مسلمانوں کو داخلے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا گیا۔ اسرائیلی میڈیا نے خبر دی ہے کہ اب ایک برابر تعداد میں مختلف اوقات میں یہودیوں اور مسلمانوں کو داخلے کی اجازت دی جائے گی۔ اس کے لیے مسلمانوں کو داخلے کے مشروط پرمٹ حاصل کرنا ہوں گے۔ ان فیصلوں کو بڑے پیمانے پر تنقید کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

القدس انٹرنیشنل انسٹی ٹیوشن نے ان فیصلوں کو سازشی ایجنڈا قرار دیا ہے جس کے مطابق پہلے مرحلے میں مسجد کو یہودی اور مسلمان حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ اسلامی اوقاف ختم کر دیا جائے گا۔ جس پر ابھی تک اردن کو نگران سمجھا جاتا ہے لیکن اس کی خاموشی بتا رہی ہے کہ وہ مسجد الاقصیٰ کے انتظامات سے دست بردار ہو چکا ہے۔ القدس نے کہا ہے کہ اسرائیل ایک سازش پر عمل پیرا ہے۔ اس کے تحت مسجد کو پہلے مرحلے میں دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ دوسرے حصے یا مرحلے میں مسجد کو مکمل طور پر یہودیانے کا کام کیا جائے گا۔ اس سے بڑا فساد ہوگا۔ مشرقی بیت المقدس، پورا فلسطین بشمول غزہ ایسی شرارت کو برداشت نہیں کریں گے، متحد ہو کر مزاحمت کریں گے۔

القدس انسٹی ٹیوشن نے کہا ہے کہ اب کوشش ہو رہی ہے کہ اتمار بن غفیر کو مسجد کے جملہ امور کا نگران بنا کر اسلامی اوقاف کو ختم کر دیا جائے۔ اس وقت مسجد کے جملہ انتظامات اسلامی اوقاف کرتا ہے جس کے لیے اردن نگرانی کرتا ہے۔ اب اس اسلامی اوقاف کو سائیڈ لائن کیا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب القدس انسٹی ٹیوشن کے مطابق یہ ہے کہ مسجد کو یہودیانے یعنی مکمل طور پر یہودی عبادت گاہ بنانے کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اس طرح مسجد کی ہر طرح سے اتھارٹی، انتظامات اور مسجد میں عبادت کا حکم سب اسرائیل کے حوالے کیے جا رہے ہیں۔ القدس نے قرار دیا ہے کہ یہ دراصل مسلم اور عرب حکمرانوں، بادشاہوں، صدور، وزرائے اعظم، گورنروں کی توہین ہے جنہوں نے خود کو زبانی جمع وخرچ تک محدود کر لیا ہے۔ ان میں اسرائیل اور اتمار بن غفیر کی جواب طلبی کی بھی جرأت نہیں ہے۔ وہ عمل کے اعتبار سے مرد و زن کی سی ہمت سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔ اب وہ رات دن میں غفیر کی صوابدیدی صدا کے محتاج ہیں۔ قبلۂ اول کی ان کے لیے حیثیت مذاکرات کار سی بھی نہیں ہے۔ یہ خاموشی شرم ناک اور ناقابل قبول ہے۔ یہ امت کے قبلۂ اول کے بارے میں عقیدے اور جذبوں کی کھلی توہین ہے۔

اطلاعات کے مطابق بن غفیر شام کے اوقات میں مسجد الاقصیٰ کے اندر داخل ہوا اس نے مسجد کے مراکشی دروازے کا انتخاب کیا۔ اس کے ساتھ پولیس کی بہت بھاری تعداد تھی۔ القدس نے کہا ہے کہ اس کے صرف اعلان کردہ منصوبوں پر ہی عمل کیا گیا تو مسجد ہمیشہ کے

براہ راست رپورٹ: بشائر ابو معمر

انسانی المیہ: غزہ میں فضائی حملوں کے بعد اب زمینی موذی جانوروں کا عذاب

غزہ میں ڈرونز کی آوازیں مدہم نہیں ہوتیں۔ یہ دن رات تباہ حال محلوں اور ٹوٹی پھوٹی زندگیوں کے اوپر منڈلاتی رہتی ہیں۔ لیکن اس مسلسل شور کے نیچے ایک اور خطرہ خاموشی سے پنپ رہا ہے، جس کے بارے میں خاندانوں کا کہنا ہے کہ وہ نہ تو اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور نہ ہی اسے کنٹرول کر سکتے ہیں۔ وہ خطرہ ہے: 'چوہے'۔

جو کبھی ایک محدود مسئلہ تھا، اب ملبے کے ڈھیروں اور تباہ شدہ گھروں میں رہنے والے خاندانوں کے لیے ایک روزمرہ کی حقیقت بن چکا ہے۔ بنیادی ڈھانچے کی تباہی اور صفائی کے نظام کے خاتمے نے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے جہاں یہ موذی جانور تیزی سے پھل پھول رہے ہیں۔

خلیل المشہر اوی کے لیے یہ خطرہ اس وقت انتہائی دردناک صورت اختیار کر گیا جب وہ اپنے گھر کے باقی ماندہ حصے میں موجود تھے۔ انہوں نے بتایا، ''میں اپنے بیٹے کے چیخنے کی آواز سن کر بیدار ہوا۔'' ان کا تین سالہ بیٹا احمد سو رہا تھا جب خلیل نے اسے خون میں لت پت پایا، اس کے ہاتھ اور ٹانگ پر کاٹنے کے نشانات تھے۔ شروع میں وہ سمجھ نہ سکے کہ کیا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا، ''مجھے توقع نہیں تھی کہ یہ چوہا ہوگا، لیکن پھر میں نے اسے دیکھ لیا۔'' وہ جانور تیزی سے قریبی ملبے میں غائب ہو گیا۔ خلیل نے اسے مارنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔

اس رات کے بعد سے خوف نے اس خاندان کی زندگی بدل دی ہے۔ خلیل اور ان کی حاملہ بیوی اب باری باری رات بھر جاگتے ہیں تاکہ اپنے بچے کی پہرے داری کر سکیں۔ احمد اکثر ڈر کر روتے ہوئے بیدار ہو جاتا ہے۔ جنگ سے پہلے، خلیل کہتے ہیں کہ یہ ناقابل تصور تھا۔ ''ہماری زندگی مستحکم تھی، ہمیں چوہوں کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔''

آج وہ حقیقت بدل چکی ہے، نہ صرف براہ راست حملوں کی صورت میں بلکہ روزمرہ کی زندگی میں ان چوہوں کی مسلسل موجودگی کی وجہ سے بھی۔

ہر شے پر قبضہ: پورے غزہ میں خاندان رپورٹ کر رہے ہیں کہ چوہے ان کی رہائشی جگہوں پر حملہ آور ہو رہے ہیں، خاص طور پر رات کے وقت۔ پرہجوم پناہ گاہوں اور جزوی طور پر تباہ شدہ گھروں میں کھانا اکثر نازک برتنوں یا تھیلوں میں رکھا جاتا ہے، جنہیں چوہے آسانی سے پھاڑ دیتے ہیں۔ خلیل نے مزید کہا، ''وہ ہر چیز کھا جاتے ہیں۔'' آٹا، روٹی، اناج اور سبزیاں اکثر خراب یا آلودہ پائی جاتی ہیں۔ وہ کھانا جس پر خاندانوں کا کئی دنوں تک انحصار ہوتا ہے، ایک ہی رات میں ضائع ہو سکتا ہے، جس کے بعد ان کے پاس ایسے حالات میں سخت فیصلے کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں بچتا جہاں سامانِ خورد و نوش پہلے ہی نایاب ہے۔

بیماریوں کا پھیلاؤ: چوہے صرف کھانا کھاتے ہی نہیں، بلکہ اسے آلودہ بھی کر دیتے ہیں۔ فضلہ، پیشاب اور سطحوں سے ان کا لمس باقی ماندہ کھانے کو غیر محفوظ بنا دیتا ہے، جس سے بیماریوں کا خطرہ بڑھ جاتا ہے بی خاص طور پر ان بچوں کے لیے جو پہلے ہی غذائی قلت اور صحت کی سہولیات کی کمی کا سامنا کر رہے ہیں۔

یہ بڑھتی ہوئی وبا براہ راست وسیع تر ماحولیاتی تباہی سے جڑی ہوئی ہے: باقاعدہ کچرا اٹھانے کے نظام کی عدم موجودگی میں گندگی کے ڈھیر لگ رہے ہیں۔ سیوریج کا نظام تباہ ہو چکا ہے۔ ملبہ ان چوہوں کو چھپنے اور نسل بڑھانے کی جگہیں فراہم کرتا ہے۔ ان حالات میں چوہوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے اور وہ تباہ شدہ عمارتوں سے آبادی والے علاقوں کی طرف آسانی سے منتقل ہو رہے ہیں۔

محدود وسائل اور مسلسل خوف: اس مسئلے پر قابو پانے کی کوششیں انتہائی محدود ہیں۔ کیڑے مار ادویات یا پیسٹ کنٹرول تک رسائی نہ ہونے کے برابر ہے۔ خاندان خود سے تدبیریں کرتے ہیں، جیسے مسلسل صفائی کرنا، کھانے کو سیل کرنا اور سامان کو اونچائی پر رکھنا، لیکن یہ اقدامات صرف عارضی ریلیف فراہم کرتے ہیں۔ جیسے ہی خاندان سونے کی کوشش کرتے ہیں، چوہے باہر نکل آتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے لیے، آرام میں خلل صرف فضائی حملوں کے خوف سے نہیں بلکہ اپنی پناہ گاہوں کے اندر حرکت کی آوازوں سے پڑتا ہے بی جو اس بات کی یاد دہانی ہے کہ خاموشی کے لمحات میں بھی وہ محفوظ نہیں ہیں۔

بچے سب سے زیادہ متاثر ہو رہے ہیں۔ زمین کے قریب سونے کی وجہ سے وہ نہ صرف چوہوں کے کاٹنے بلکہ آلودہ ماحول اور خوراک کا بھی زیادہ شکار ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ جسمانی اور نفسیاتی دونوں صورتوں میں نکل رہا ہے: بیماری، خوف اور ان جگہوں پر عدم تحفظ کا مستقل احساس جو تحفظ فراہم کرنے کے لیے بنی تھیں۔

یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ صرف ایک کیڑے مکوڑوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ اس تباہی کا نتیجہ ہے جس میں نظام کام کرنا چھوڑ چکے ہیں، فضلے کا انتظام نہیں ہو سکتا، اور کمیونٹیز ایسے حالات میں رہنے پر مجبور ہیں جہاں بنیادی تحفظ بھی ان کی پہنچ سے باہر ہے۔

آج کے غزہ میں، بقا کا مطلب صرف آسمان سے گرنے والی موت سے بچنا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب ان چیزوں کا مقابلہ کرنا بھی ہے جو زمین سے، اندھیرے میں، ملبے سے اور ان کمزور جگہوں کے اندر سے نکلتی ہیں جنہیں لوگ اب بھی اپنا ''گھر'' کہتے ہیں۔

اپنے ہی ہاتھوں اپنے خوابوں کی تدفین

صیہونی ریاستی جبر کے سائے میں اپنے گھر کو ملبہ بنتے دیکھتے فلسطینیوں کا نوحہ

ارض فلسطین وہ زمین ہے جہاں زیتون کے درختوں کی جڑوں میں صدیوں کی تاریخ دفن ہے، جہاں کی ہواؤں میں اذانوں اور ناقوس کی آوازیں ایک مقدس ہم آہنگی سے گونجتی ہیں، آج وہاں کی مٹی اپنے ہی بیٹوں کے خون اور آنسو پی رہی ہے۔ فلسطین جو انبیاء کی سرزمین ہے آج ایک ایسی تجربہ گاہ بن چکا ہے جہاں دنیا کے کونے کونے سے چن کر لائے گئے صیہونی انسانیت کی تذلیل کے نئے طریقے ایجاد کر رہے ہیں۔ ان میں سب سے ہولناک اور روح فرسا طریقہ ''خود ساختہ مسماری'' (Self-demolition) ہے۔ ایک ایسا مجرمانہ عمل جہاں ایک باپ کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اس چھت کو اپنے ہاتھوں سے گرا دے جس کے سائے میں اس کی نسلیں پروان چڑھی ہیں اور اس جس کی تعمیر میں اس نے اپنا اور اپنے بچوں کا خون پسینہ بہایا۔

یہ محض اینٹ اور گارے کے ڈھیر گرانے کی کہانی نہیں ہے، یہ ان خوابوں کا قتلِ عام ہے جو ان دیواروں کے بیچ بُنے گئے تھے۔ یہ قابض ریاست کے ناسور کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی تکالیف کا نوحہ ہے جس میں صیہونی ریاست نے قانون کی آڑ میں فلسطینیوں کو اپنے ہی گھروں کا قصائی بنا دیا۔

جبری مسماری لرزہ خیز اعداد و شمار: فلسطینیوں پر ریاستی جبر کے طور پر مکانات مسماری کا ظلم برسوں سے جاری ہے۔ فلسطینیوں پر ٹوٹنے والے اس ظلم کو اگر اعداد و شمار کے خشک خانے میں دیکھا جائے تو یہ کسی ہولوکاسٹ سے کم نظر نہیں آتا۔ انتفاضہ دوم کے دوران انتقامی کارروائیوں کے طور پر ہزاروں مکانات کو بلڈوز کیا گیا۔ اس دہائی میں اسرائیل نے ''امن و امان'' کا بہانہ بنا کر فلسطینیوں کی کمر توڑنے کی کوشش کی۔

2011ء-2020ء کا دور ''انتظامی مسماری'' کے عروج کا دور تھا۔ اسرائیل نے میونسپلٹی قوانین کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا۔ ''بغیر اجازت تعمیر'' (Unlicensed Construction) کا وہ لیبل لگایا گیا جو کسی بھی فلسطینی کے لیے موت کے پروانے سے کم نہ تھا۔ اس سیاہ قانون کے نتیجے میں ہزاروں فلسطینی خاندانوں کو ان کے گھر کی چھت سے محروم کر دیا گیا۔ سیکڑوں خاندان بھاری جرمانوں کے بوجھ سے بچنے کے لیے اپنے ہاتھوں اپنے گھروں کو ملبے کا ڈھیر بنانے پر مجبور ہو گئے۔

موجودہ صورتحال (2021ء - 2025ء): پچھلے پانچ برسوں میں مسماری کی شرح میں 300 فیصد اضافہ دیکھا گیا ہے۔ 2024ء اور 2025ء کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ صرف مقبوضہ بیت المقدس میں ہر دوسرے دن ایک فلسطینی خاندان اپنے گھر کی دیواریں اپنے ہاتھوں سے گرا رہا ہے۔

'سیلف ڈیمولیشن' کی نفسیات: صیہونی ریاست کا سب سے مکروہ پہلو یہ ہے کہ وہ ظلم کو قانونی رنگ دے کر مظلوم ہی کے ہاتھوں انجام دلاتی ہے۔ جب کسی فلسطینی کو "مسماری کا نوٹس" ملتا ہے، تو اسے دو میں سے ایک راستہ چننا ہوتا ہے۔

پہلا راستہ: وہ خاموش رہے اور اسرائیلی بلڈوزروں کا انتظار کرے۔ اس صورت میں اسے نہ صرف اپنا گھر ٹوٹتے دیکھنا ہوگا بلکہ ''مسماری کی اجرت'' کے نام پر صیہونی ریاست کو لاکھوں شیکلز (ہزاروں ڈالرز) ادا کرنے ہوں گے۔ اگر وہ یہ خطیر رقم ادا نہ کر سکے تو تاریک زندان اس کا مقدر ہوتے ہیں جہاں اسے برس ہا برس تک پابند سلاسل رکھا جاتا ہے۔

دوسرا راستہ: وہ خود ہتھوڑا اٹھائے، اپنے بچوں کو باہر کھڑا کرے اور اس دیوار کو گرانا شروع کر دے جسے اس نے اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی سے بنایا تھا۔ زیادہ تر فلسطینی خاندان بھاری جرمانوں اور قید و بند کی صعوبتوں سے بچنے کے لیے دوسرے راستے کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ انتخاب نہیں بلکہ ایک ایسی ذلت ہے جو انسان کی روح کو چھلنی کر دیتی ہے۔

متاثرین کی داستانیں: جب ہتھوڑا خوابوں پر چلتا ہے۔۔ بیت المقدس کے مضافات میں رہنے والے 60 سالہ ابو محمد کی آنکھوں میں وہ منظر آج بھی تازہ ہے جب اسے اپنے ہی گھر کو گرانے کا حکم ملا۔ اس نے میڈیا کو بتایا کہ ''میں نے اس گھر کی ایک ایک اینٹ اپنے ہاتھوں سے رکھی تھی۔ جب میں نے پہلی بار ہتھوڑا دیوار پر مارا، تو مجھے محسوس ہوا جیسے میں اپنے ہی سینے پر وار کر رہا ہوں۔ میرے پوتے پوتیوں کے کھلونے اب بھی اس ملبے تلے دبے ہیں، اور میں اب بھی رات کو سوتے ہوئے ان دیواروں کی چیخیں سنتا ہوں۔''

ام احمد جس کا شوہر برسوں پہلے انتقال کر گیا تھا نے مقبوضہ مغربی کنارے کے شمالی شہر نابلس میں سلائی کڑھائی کر کے ایک چھوٹا سا کمرہ تعمیر کیا تھا۔ 2024ء کی ایک سرد صبح اسے حکم ملا کہ یہ کمرہ ''غیر قانونی'' ہے۔ اس کے پاس جرمانہ بھرنے کے پیسے نہیں تھے۔ اس نے اپنے بھائیوں کی مدد سے اس کمرے کو گرایا۔ وہ کہتی ہے کہ ''اسرائیلی سپاہی دور کھڑے ہنستے ہوئے میری ویڈیو بنا رہے تھے جبکہ میں اپنی چادر کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے اپنی چھت کے گاڈر نیچے اتار رہی تھی۔''

مکانات کی مسماری محض آبادکاری کا مسئلہ نہیں، بلکہ یہ ''اقتصادی دہشت گردی'' ہے۔ ایک فلسطینی خاندان جو دہائیوں کی محنت سے ایک گھر بناتا ہے، اسے ایک لمحے میں ملبے کا ڈھیر بنا کر اسے دوبارہ خطِ غربت سے نیچے دھکیل دیا جاتا ہے۔

مقبوضہ بیت المقدس میں ایک تعمیراتی اجازت نامہ (Permit) حاصل کرنے کی قیمت 50 ہزار ڈالر سے زائد ہو سکتی ہے، اور اس کے باوجود 99 فیصد درخواستیں مسترد کر دی جاتی ہیں۔

جو خاندان خود گھر نہیں گراتے، ان پر اتنا جرمانہ عائد کیا جاتا ہے کہ ان کی آنے والی نسلیں بھی اس قرض تلے دبی رہتی ہیں۔ یہ ایک ایسا چکر ہے جس کا مقصد فلسطینیوں کو معاشی طور پر مفلوج کر کے ہجرت پر مجبور کرنا ہے۔

دنیا کے بڑے بڑے فورمز پر انسانی حقوق کے گن گائے جاتے ہیں، لیکن فلسطین کے ان ٹوٹتے گھروں کی آواز شاید ان کے کانوں تک نہیں پہنچتی۔ اقوام متحدہ کی قراردادیں صرف کاغذ کا پیٹ بھرتی ہیں، جبکہ زمین پر حقیقت یہ ہے کہ 2000ء سے 2025ء کے درمیان تقریباً 50 ہزار سے زائد فلسطینی بچے کھلے آسمان تلے سونے پر مجبور کیے گئے۔ اگر غزہ کی پٹی کے بے سروسامان فلسطینیوں کو شامل کیا جائے تو یہ تعداد بیس لاکھ سے تجاوز کر جاتی ہے۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں تین تین بار اپنا گھر مسمار ہوتے دیکھا۔

سلوان۔۔ جبری ہجرت اور اپنے ہی ہاتھوں اپنا گھر اجاڑنے کا المیہ: مقبوضہ بیت المقدس سے فرانسیسی میگزین لونوفیل اوبس کے خصوصی مندوب دیمتری کریلی کی ایک فیلڈ رپورٹ میں مشرقی مقبوضہ بیت المقدس کے قصبے سلوان میں جاری انسانیت سوز مظالم کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے جو کلیجہ چیر دینے والی ہے۔ یہاں سینکڑوں فلسطینی خاندانوں کو قابض صہیونی حکومت کی سرپرستی میں جاری استعماری توسیع پسندی کی پالیسی کے تحت اپنے گھروں سے محروم ہونے کے خطرے کا سامنا ہے۔

رپورٹ کے مطابق تقریباً 150 فلسطینی گھروں کو مسمار کرنے کے احکامات جاری کیے گئے ہیں، یہ وہ علاقہ ہے جہاں 60 ہزار کے قریب فلسطینی آباد ہیں۔ ان مسماریوں کا مقصد اس علاقے میں توسیع کرنا ہے جسے قابض اسرائیلی شہر داؤد کے نام سے منسوب کرتے ہیں، تاکہ مقامی فلسطینیوں کو نکال کر وہاں غاصب صہیونی آبادکاروں کو بسایا جا سکے۔

رپورٹ میں روزانہ کے ان المیہ مناظر کا ذکر کیا گیا ہے جہاں قابض اسرائیل کے بلڈوزر رہائیوں پرانے مکانات کو ملبے کا ڈھیر بنا دیتے ہیں، خاندانوں کو زبردستی نکال دیا جاتا ہے اور پھر غاصب آبادکاران چھینی گئی املاک پر قابض اسرائیلی جھنڈے لہرا کر جشن مناتے ہیں۔

نامہ نگار کے مطابق یہ سب کچھ کسی خلا میں نہیں ہو رہا بلکہ قابض اسرائیل کے بنائے گئے ایک ایسے قانون کے تحت کیا جا رہا ہے جو یہودیوں کو 1948ء سے پہلے کی جائیدادوں پر دعویٰ کرنے کی اجازت دیتا ہے، جبکہ دوسری طرف فلسطینیوں کے لیے تعمیراتی اجازت نامہ حاصل کرنا ناممکن بنا دیا گیا ہے۔

رپورٹ میں 62 سالہ امین جلاجل کی دلخراش کہانی بیان کی گئی ہے، جنہیں اس گھر کو مسمار کرنے کا حکم ملا ہے جہاں وہ پیدا ہوئے تھے۔ امین جلاجل کہتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں ہمارے پاس تعمیراتی اجازت نامہ نہیں ہے، لیکن میں تو اسی گھر میں پیدا ہوا تھا، کیا اب میری پیدائش بھی غیر قانونی ہے؟

جلاجل خاندان کے اس محلے میں چھ گھر تھے جن میں سے اب صرف ایک بچا ہے جس میں خاندان کی کئی نسلوں کے 96 افراد ایک ساتھ رہنے پر مجبور ہیں۔ امین اس اذیت ناک انتخاب کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یا تو ہم اپنا گھر اپنے ہی ہاتھوں مسمار کر دیں، یا پھر قابض فوج کو گھر گرانے کے لیے 1 لاکھ شیکل (تقریباً 27 ہزار ڈالر) ادا کریں، یہ وہ جبر ہے جس میں یہاں کے مکین زندگی گزار رہے ہیں۔

مظالم کا یہ سلسلہ صرف گھر چھیننے تک محدود نہیں بلکہ یہ نفسیاتی اور مالیاتی دہشت گردی تک پھیلا ہوا ہے۔ امین کے بھتیجے احمد بتاتے ہیں کہ انہوں نے پہلے غیر قانونی تعمیر کے نام پر بھاری جرمانہ ادا کیا اور پھر کچھ عرصہ بعد انہیں گھر مسمار کرنے کا حکم دے دیا گیا اور ان کی زندگی بھر کی کمائی ملبے کا ڈھیر بن گئی۔ وہ بتاتے ہیں کہ خاندان کو مسلسل دھمکیاں دی جاتی ہیں جبکہ غاصب آبادکاران کی بچی کچی املاک کو بھاری رقوم کے عوض خریدنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ انہیں یہاں سے جلد از جلد نکالا جا سکے۔

ایک اور متاثرہ فلسطینی 37 سالہ وسیم صیام کی کہانی انتہائی غمزدہ کر دینے والی ہے، جنہوں نے سرکاری حکم کی تعمیل میں اپنے ہاتھوں سے اپنا گھر مسمار کیا۔ وہ وہاں اپنی بیوی، پانچ بچوں اور بیمار ماں کے ساتھ رہتے تھے۔ وسیم کہتے ہیں کہ انہیں نہ میری صحت کی پرواہ ہے، نہ میری بوڑھی ماں کی اور نہ ہی میرے بچوں کی چھت کی، انہیں صرف غاصب آبادکاروں کا آرام عزیز ہے، انہوں نے ہماری زندگیوں کو جہنم بنا دیا ہے۔

رپورٹ انکشاف کرتی ہے کہ سنہ 2022ء سے جب سے قابض اسرائیل میں دائیں بازو کی انتہا پسند حکومت آئی ہے، مشرقی مقبوضہ بیت المقدس اور مغربی کنارے میں مسماری اور آبادکاری کی پالیسی میں تیزی آ گئی ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق گزشتہ دو دہائیوں میں مغربی کنارے میں غاصب آبادکاروں کی تعداد بڑھ کر 5 لاکھ تک پہنچ گئی ہے اور عالمی برادری کی تنقید کے باوجود نئی بستیوں کی تعمیر جاری ہے۔

رپورٹ فلسطینیوں کے خلاف روزانہ کی بنیاد پر ہونے والے امتیازی سلوک کی بھی عکاسی کرتی ہے، جہاں فلسطینیوں کو بنیادی سہولیات سے محروم رکھا جاتا ہے جبکہ غاصب آبادکاروں کو مکمل تحفظ اور خدمات فراہم کی جاتی ہیں۔ مکین بتاتے ہیں کہ پانی کے وہ چشمے جو وہ دہائیوں سے استعمال کر رہے تھے اب ان پر غاصب آبادکاروں کا قبضہ ہے جہاں وہ اپنے مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں۔

ان خطرناک حالات کے باوجود قابض اسرائیل کے اندر مخالفت کی آوازیں انتہائی کمزور ہیں کیونکہ وہاں کی سیاسی قیادت اس توسیع پسندی کی مکمل حمایت کرتی ہے۔ سلوان کے مکین اب مستقل خوف اور بے یقینی کی کیفیت میں جیتے ہیں اور کیمروں کے ذریعے اپنے گھروں کے داخلی راستوں کی نگرانی کرتے ہیں کہ نہ جانے کس لمحے قابض فوج کے بلڈوزران کی چھت چھیننے پہنچ جائیں۔

مختصر یہ کہ یہ رپورٹ فلسطینیوں کی نسل کشی اور ان کی شناخت مٹانے کی اس خاموش پالیسی کا زندہ ثبوت ہے، جہاں شہریوں کو نہ صرف طاقت کے زور پر بلکہ قانونی، معاشی اور نفسیاتی دباؤ کے ذریعے اپنی زمین چھوڑنے پر مجبور کیا جا رہا ہے تاکہ اس تاریخی شہر کا جغرافیہ اور آبادی کا تناسب ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دیا جائے۔

صہیونی ریاست کا خیال ہے کہ گھر گرا دینے سے وہ فلسطینیوں کے حوصلے بھی گرا دے گی، لیکن وہ یہ بھول جاتی ہے کہ مکان اینٹوں سے بنتا ہے اور "وطن" جذبوں سے۔ جب ایک فلسطینی اپنے ہاتھ سے گھر گرا رہا ہوتا ہے، تو وہ زمین سے جدا نہیں ہوتا بلکہ اس کی جڑیں اس مٹی میں مزید گہری ہو جاتی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی اور زندہ مثال غزہ ہے، جہاں لاکھوں لوگ گھر بار سے محروم ہو گئے مگر وہ اپنے وطن کی مٹی سے جڑے ہوئے ہیں، وہ بوسیدہ اور پھٹے پرانے کپڑوں کے چھیتڑے بنا کر ان میں سر چھپاتے ہیں مگر صہیونی دشمن کے ظلم اور مکر و فریب میں آ کر اپنا ملک نہیں چھوڑتے۔ غرب اردن اور القدس میں مسمار کردہ گھروں کے مظلوم اور بے بس مکین ملبے کے اسی ڈھیر پر بیٹھ کر قہوہ پیتے ہیں اور دنیا کو پیغام دیتے ہیں کہ ''تم دیواریں گرا سکتے ہو، ہمارا تعلق اس مٹی سے نہیں چھین سکتے۔''

تاریخ گواہ ہے کہ جبری مسماری کی یہ پالیسی اسرائیل کی سب سے بڑی اخلاقی شکست ہے۔ تاریخ میں جب بھی ظالموں کا تذکرہ ہوگا، ان لوگوں کا نام سب سے اوپر ہوگا جنہوں نے نہ صرف زمین غصب کی، بلکہ انسانوں کو اپنے ہی آشیانے جلانے پر مجبور کیا۔ مگر یاد رہے ملبے کے ہر ڈھیر کے نیچے ایک نئی مزاحمت جنم لیتی ہے۔

تجزیہ: ربی میسون

استعمار کا برہنہ چہرہ: فریڈم فلوٹیلا، عقیدۂ تکبر اور اسرائیلی بیانیے کا ساختیاتی زوال

بین الاقوامی سیاست میں کسی بھی ریاست کا عالمی تشخص (Global Image) محض ایک سفارتی اوزار نہیں ہوتا، بل کہ یہ اس کے سیاسی وجود کی اخلاقی جوازیت (Moral Legitimacy) کا ضامن ہوتا ہے۔ صیہونی ریاست نے دہائیوں تک مغرب میں اپنے لیے 'مشرقِ وسطیٰ کی واحد جمہوریت' اور 'مظلومیت کے تاریخی استثنیٰ' کا جو تشخص برقرار رکھا تھا، وہ اب ساختیاتی شکست (Structural Collapse) سے دوچار ہے۔

مئی 2026 میں 'فریڈم فلوٹیلا' کے غیر ملکی اور سویلین یکجہتی کے کارکنوں پر اسرائیلی وزیرِ قومی سلامتی اتمار بن غفیر کی سرپرستی میں ہونے والا حالیہ تشدد اور تذلیل محض ایک انتہا پسند وزیر کا وقتی ابال نہیں ہے، بل کہ یہ اس 'عقیدۂ تکبر' (Doctrine of Arrogance) کا عکاس ہے جو اسرائیلی ریاستی ڈھانچے کی بنیاد بن چکا ہے۔ یہ واقعہ ایک ایسے سنگین عالمی اور سفارتی بحران کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا ہے جس نے نہ صرف اسرائیل اور اس کے روایتی مغربی اتحادیوں کے درمیان موجود اخلاقی خلیج کو گہرا کر دیا ہے، بل کہ اس منظم ریاستی تذلیل، تشدد اور فاقہ کشی کے نظام کو بھی بے نقاب کر دیا ہے جو طویل عرصے سے فلسطینی اسیروں اور عوام پر پسِ چلمن آزمایا جا رہا تھا۔

اسرائیلی قومی سلامتی کے وزیر اتمار بن غفیر کی جانب سے ''فریڈم فلوٹیلا'' کے کارکنوں کے نشر کیے گئے مناظر محض ایک انتہائی دائیں بازو کے وزیر کا انفرادی رویہ نہیں تھا، بل کہ چند ہی گھنٹوں میں یہ ایک بڑا بین الاقوامی مسئلہ بن گیا جس نے اسرائیلی نظام کے اندر، چاہے وہ فلسطینیوں کے خلاف ہو یا خود غیر ملکی یکجہتی کے کارکنوں کے خلاف، بدسلوکی اور تذلیل کی ذہنیت سے متعلق الزامات کی ایک طویل فائل کو دوبارہ کھول دیا۔

ویڈیو کا وہ حصہ، جس میں کارکنوں کو ہتھکڑیاں لگے، ان کے سر زمین پر جھکے ہوئے، چیخ و پکار، گالی گلوچ اور بن غفیر کے ایک سیاسی شو کے درمیان دکھایا گیا تھا، نے نہ صرف کئی مغربی ممالک کے ساتھ ایک وسیع سفارتی بحران پیدا کیا، بل کہ اس تضاد کے پیمانے کو بھی بے نقاب کر دیا جو اسرائیل اپنے بارے میں مارکیٹ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور تکبر، نسل کشی اور منظم تذلیل کے اصل اقدامات کے درمیان پایا جاتا ہے۔

وسیع پیمانے پر غم و غصہ:

بین الاقوامی ردعمل کے بارے میں جو بات قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ یہ صرف روایتی سفارتی بیانات تک محدود نہیں رہے، بل کہ نوبت فرانس، اسپین، اٹلی، نیدرلینڈز، بیلجیم اور کینیڈا سمیت کئی مغربی دارالحکومتوں میں اسرائیل کے سفیروں کو طلب کرنے تک پہنچ گئی، یہ ایک ایسا قدم ہے جو اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ اس ویڈیو نے مغربی حکومتوں کو ان کی

عوامی رائے عامہ کے سامنے کتنی شدید شرمندگی سے دوچار کیا ہے۔

یورپی حکام نے ان مناظر کو ''خوفناک''، ''تذلیل آمیز'' اور ''انسانی وقار کے منافی'' قرار دیا، جب کہ میڈرڈ نے بن غفیر پر فوری یورپی پابندیاں عائد کرنے کا مطالبہ کیا، یہ ایک جاری اور پے در پے پیش رفت ہے جو اسرائیلی حکومت کی طرف یورپی سیاسی زبان میں تبدیلی کی عکاسی کرتی ہے۔

ہسپانوی وزیر اعظم پیڈرو سانچیز محض مذمت سے بھی آگے نکل گئے، جب انہوں نے اعلان کیا کہ ان کا ملک اس فائل کو یورپی یونین کے اداروں کے اندر اٹھائے گا، جو اس بات کا اشارہ ہے کہ یہ مسئلہ اپنی انسانی جہت سے بالاتر ہو کر اسرائیل کے ساتھ یورپ کے تعلقات کے لیے ایک سیاسی اور اخلاقی امتحان میں تبدیل ہو چکا ہے۔

مغرب کس چیز سے صدمے میں آیا؟

تضاد یہ ہے کہ ''فریڈم فلوٹیلا'' کے کارکنوں کے ساتھ جو کچھ کیا گیا وہ فلسطینیوں یا انسانی حقوق کی تنظیموں کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے، لیکن یہ اس وقت حیران کن معلوم ہوا جب یہ سب کچھ پبلک کیمروں کے سامنے اور اس برتری، تکبر، اشتعال انگیزی اور انسانی توہین کے ساتھ ہوا اور ان کارکنوں کے خلاف ہوا جن میں سے اکثر مغربی شہریت رکھتے ہیں۔

رسمی مغرب، جس نے طویل عرصے تک اسرائیلی قابض جیلوں میں فلسطینی قیدیوں پر ڈھائے جانے والے تشدد، منظم تذلیل اور یہاں تک کہ عصمت دری کے بارے میں ان کی گواہیوں کو نظر انداز کیا، اس بار اپنے آپ کو ایسی براہ راست تصاویر کے سامنے پایا جن کا جواز پیش کرنا یا جنہیں نظر انداز کرنا مشکل ہے، خاص طور پر اس لیے کہ جو لوگ ویڈیو میں نظر آئے وہ جنگجو نہیں، بل کہ شہری یکجہتی کے کارکن تھے جو غزہ کا محاصرہ توڑنے آئے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ اس مسئلے نے اپنی سنگینی حاصل کی، کیوں کہ اس نے اسرائیل کی ذہنیت اور وہ فلسطینیوں اور قیدیوں کے خلاف جو کچھ کرتا ہے اس کا ایک مختصر منظر پیش کیا۔

فریڈم فلوٹیلا سے اسرائیلی جیلوں تک:

اس حملے نے ان واقعات پر بھی دوبارہ روشنی ڈالی ہے جو برسوں سے اسرائیلی جیلوں کے اندر ہو رہے ہیں اور خاص طور پر اکتوبر 2023 کے بعد غزہ پر صہیونی نسل کشی کی جنگ کے بعد سے۔

انسانی حقوق کے لیے اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر کے ترجمان کے بیانات کے مطابق یہ تصدیق ہوئی ہے کہ اسرائیل نے تشدد، بدسلوکی، غفلت اور غیر انسانی خلاف ورزیوں کے نتیجے میں اسرائیلی جیلوں کے اندر تقریباً 90 فلسطینی نظر بندوں کو شہید کیا۔

اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کی رپورٹوں میں اسرائیلی جیلوں میں فلسطینی نظر بندوں کے ساتھ متعدد اقسام کی خلاف ورزیوں کا ذکر کیا گیا ہے، جن میں شدید جسمانی تشدد، فاقہ کشی، جان بوجھ کر طبی غفلت، اس کے علاوہ جنسی تشدد اور تذلیل آمیز حملے، نیز طویل عرصے تک بیڑیاں پہنانا، نیند سے محروم کرنا، مار پیٹ، گھسیٹنا اور نفسیاتی تذلیل شامل ہیں، ان طریقوں کے بارے میں انسانی حقوق کے اداروں کا کہنا ہے کہ یہ اسرائیلی حراستی مراکز کے اندر غیر انسانی سلوک کے ایک منظم انداز کی عکاسی کرتے ہیں۔

جاری تبدیلی میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسرائیلی جیلوں کے اندر تشدد، تذلیل اور خلاف ورزیوں سے متعلق الزامات اب صرف فلسطینی بیانیے یا انسانی حقوق کی تنظیموں کی رپورٹوں تک محدود نہیں رہے، جن کا اسرائیل نے ہمیشہ شکوک و وہبات اور انکار کے ساتھ سامنا کیا ہے، بل کہ اب یہ تیزی سے مغربی میڈیا کے اندر اپنی جگہ بنانے لگے ہیں، جس کے گہرے سیاسی اثرات ہیں۔ جب بااثر مغربی اخبارات اور میڈیا ادارے، جن میں سے کچھ تاریخی طور پر اسرائیلی بیانیے سے قربت یا اس فائل تک پہنچنے میں انتہائی احتیاط کے لیے جانے جاتے تھے، حراستی مراکز کے اندر تشدد، جنسی تشدد، فاقہ کشی اور تذلیل کے بارے میں گواہیاں اور رپورٹیں شائع کرنا شروع کر دیتے ہیں، تو یہ اسرائیل کے بارے میں مغرب کے اندر جاری بحث میں ایک بتدریج تبدیلی کی عکاسی کرتا ہے اور اس استثنیٰ کے خاتمے کی پیش گوئی کرتا ہے جس سے وہ دہائیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

مغربی میڈیا کے اندر مسلسل صدمے:

صحافتی ادارے بے مثال انداز میں ان فائلوں کے قریب جا رہے ہیں جنہیں اسرائیل دہائیوں تک فلسطینی بیانیے یا انسانی حقوق کی رپورٹوں کے حاشیے میں رکھنے میں کامیاب رہا جن پر سیاسی اور انتظامی طور پر سوالات اٹھائے جاتے تھے۔ اسرائیلی حراستی مراکز کے اندر خلاف ورزیوں کے بارے میں بحث اب انسانی حقوق کی تنظیموں کے بیانات یا فلسطینی قیدیوں کی گواہیوں تک محدود نہیں رہی، بل کہ آہستہ آہستہ وسیع پیمانے پر بااثر مغربی پریس میں اپنی جگہ بنا رہی ہے، جس کے تمام تر اثرات انسانی حقوق کے دائرے سے نکل کر خود مغرب کے اندر سیاسی اور اخلاقی مزاج میں تبدیلی کی سطح تک پہنچ رہے ہیں۔

اس تناظر میں معروف مغربی اور اسرائیلی اخبارات میں شائع ہونے والی رپورٹوں اور تحقیقات نے اسرائیلی جیلوں کے اندر کیا ہو رہا ہے اور غزہ پر جنگ کے بعد سے فلسطینی نظر بندوں کے خلاف کی جانے والی تشدد کی شدت کے بارے میں ایک وسیع بحث چھیڑ دی ہے۔ اسرائیلی اخبار ''ہارتز'' نے غیر معمولی لہجے میں متعدد فلسطینی قیدیوں کے ''کنکالوں'' میں تبدیل ہونے کی بات کی اور ان کے حالات میں اس شدید گراوٹ کو جیلوں کے اندر اسرائیلی قومی سلامتی کے وزیر اتمار بن غفیر کی قیادت میں چلنے والی پالیسیوں سے جوڑا، بشمول فاقہ کشی، بدسلوکی اور حراستی شرائط کو منظم طریقے سے سخت کرنا۔

امریکہ میں امریکی مصنف اور صحافی نکولس کرسٹوف نے سابق فلسطینی نظر بندوں کی گواہیاں شائع کرنے کے بعد تنازع کا ایک طوفان برپا کر دیا جنہوں نے ان خلاف ورزیوں کے بارے میں بات کی جنہیں ہولناک قرار دیا گیا، بشمول تشدد، جنسی تشدد اور منظم تذلیل۔ ان گواہیوں کی اہمیت نہ صرف ان کے مواد میں تھی، بل کہ اس حقیقت میں بھی تھی کہ یہ عوامی رائے عامہ اور فیصلہ سازوں پر وسیع اثر و رسوخ رکھنے والے مغربی میڈیا پلیٹ فارمز کے ذریعے سامنے آئیں۔

ان تبدیلیوں کا خطرہ اس بات میں ہے کہ یہ تنقید کو روکنے یا اسے انسانی حقوق کے تنگ فریم ورک کے اندر الگ تھلگ کرنے کی روایتی اسرائیلی بیانیے کی صلاحیت میں کمی کی طرف اشارہ کرتی ہیں، کیوں کہ تشدد، توہین اور اجتماعی سزا سے متعلق الزامات طویل برسوں کے سیاسی اور میڈیا تحفظ کے بعد، جو اسرائیل کو حاصل تھا، آہستہ آہستہ عام مغربی بحث کے مرکز میں جا رہے ہیں۔ یہی چیز ''فریڈم فلوٹیلا'' کے کارکنوں کے ساتھ بدسلوکی کے مناظر کو محض ایک عارضی واقعہ نہیں بناتی، بل کہ اس وسیع تر تصویر کا حصہ بناتی ہے جو جنگ، جیلوں اور محاصرے کا انتظام کرنے والے نظام کی نوعیت کے بارے میں عالمی سطح پر بننا شروع ہو گئی ہے۔

بن غفیر: ایک استثنیٰ یا پورا نظام؟

کچھ اسرائیلی اور مغربی حلقے بن غفیر اور دیگر کو ایک استثنیٰ اور ایک انتہائی کیس کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو ''اسرائیلی ریاست'' سے الگ ہے، لیکن حالیہ بین الاقوامی ردعمل ایک الگ سوال کھڑا کرتا: ''کیا مسئلہ وزیر کی ذات میں ہے، یا اس سیاسی ماحول میں ہے جو انہیں اقتدار کے مرکز میں لایا؟''

وہ حکومت سے باہر کام نہیں کرتے بل کہ انتہائی حساس وزارتوں میں سے ایک پر فائز ہیں اور انہیں وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو کی حمایت حاصل ہے۔ جیلوں، چوکیوں اور یروشلم کے اندران کی پالیسیاں حقیقی جوابدہی کے بغیر برسوں سے دہرائی جارہی ہیں۔

اسی وجہ سے مبصرین کا خیال ہے کہ ''فریڈم فلوٹیلا'' کی ویڈیو میں جو کچھ ظاہر ہوا وہ کوئی انفرادی انحراف نہیں ہے، بل کہ ایک ایسی سیاسی اور سیکورٹی ثقافت کا بھرپور اظہار ہے جو تذلیل کے ذریعے خوف پیدا کرنے اور فلسطینیوں اور ان کے ساتھ یکجہتی کرنے والوں کے سامنے طاقت دکھانے پر مبنی ہے۔

ایکس (ٹویٹر) پلیٹ فارم پر اپنے پیج پر ایک قابل ذکر تجزیے میں اسرائیلی امور کے ماہر ایہاب جبارین اس خیال کا ایک تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہیں۔ جبارین کہتے ہیں: ''اگر بن غفیر اسرائیل کی نمائندگی نہیں کرتے... ساعر کے مطابق اور سموٹریش لاپیڈ کے مطابق اس کی نمائندگی نہیں کرتے، اور نیتن یاہو اپوزیشن کے مطابق اس کی نمائندگی نہیں کرتے کیوں کہ وہ 'ریاست کو یرغمال بنا رہے ہیں'، اور آبادکار اور پہاڑی نوجوان نیتن یاہو کے مطابق اسرائیل کی نمائندگی نہیں کرتے، اور حریدی 'اسرائیلی' کی نمائندگی نہیں کرتے کیوں کہ وہ فوج میں بھرتی نہیں ہوتے اور فوج کے سپاہی 'اسرائیل کی اقدار' کی نمائندگی نہیں کرتے جب بھی جنوبی لبنان کے ایک چرچ میں کوئی نیا اسکینڈل سامنے آتا ہے اور اپوزیشن حکومت کے مطابق اس کی نمائندگی نہیں کرتی اور عدلیہ دائیں بازو کے مطابق اس کی نمائندگی نہیں کرتی اور تل ابیب میں مظاہرین اتحاد کے مطابق اسرائیل کی نمائندگی نہیں کرتے اور بین الاقوامی برادری 'اسرائیل کی حکومت کے اقدامات' کے ساتھ اس طرح پیش آتی ہے جیسے وہ اسرائیل ہی سے کوئی الگ چیز ہیں اور اس کی نمائندگی نہیں کرتے... ٹھیک ہے، تو پھر اس بیابان کی نمائندگی کون کرتا ہے؟!''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بحران اب سیاسی دھاروں کے درمیان فرق تک محدود نہیں رہا، بل کہ خود اس ہستی کی شناخت کی تعریف پر ایک کھلی اندرونی جنگ میں تبدیل ہو چکا ہے۔

ایک طرف بن غفیر اور سموٹریش اور دوسری طرف نیتن یاہو اور فوجی اسٹیبلشمنٹ، پولیس، عدالتی نظام اور آبادکاروں اور مذہبی دائیں بازو کے دھاروں کے درمیان وژن میں اتنا فرق نظر نہیں آتا جتنا کہ اس بات پر جھگڑا نظر آتا ہے کہ ''اسرائیل'' کی تعریف کرنے کا حق کس کے پاس ہے اور اصل میں اس کی نمائندگی کون کرتا ہے۔

اس ٹوٹ پھوٹ میں جو چیز توجہ مبذول کراتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کوئی قدرتی تکثیریت پیدا نہیں کرتی جتنا کہ یہ ''نمائندگی کی قانونی حیثیت'' کو چھیننے کے الزامات کے مسلسل تبادلے کی حالت کو ظاہر کرتی ہے، جہاں ہر فریق دوسرے پر الزام لگاتا ہے کہ وہ ریاست کی شبیہ کو مجسم نہیں کرتا اور اس کے جوہر کی عکاسی نہیں کرتا، جب کہ ہر کوئی قریبی درجے تک طاقت کے تکبر کے اسی منطق اور اس کے اوزاروں پر عمل پیرا ہے، بشمول ساختی تشدد، ادارہ جاتی بالادستی اور برتری اور کنٹرول کے بیانیے کو دوبارہ پیدا کرنا۔ اس طرح یہ تنازع کسی سیاسی نظام کے اندر محض تضادات کی طرح نہیں لگتا بل کہ ایک ہی ڈھانچے کا عکاس ہے جس کے مراکز تو متعدد ہیں لیکن ان کا رویہ ایک دوسرے سے ملتا ہے، جہاں سیاسی، سیکورٹی اور مذہبی کردار ایک دوسرے میں مدغم ہو کر منظم تکبر پر مبنی ایک واحد نقطہ نظر پیدا کرتے ہیں اور تنازع کو وجود کے لیے ایک مستقل شرط کے طور پر چلاتے ہیں۔

اس تناظر میں، سوال اب صرف یہ نہیں رہا کہ ''اسرائیل'' کی نمائندگی کون کرتا ہے بل کہ یہ ہے کہ کیا یہ ہستی ابھی تک اپنے آپ کی ایک مربوط تعریف کا امکان برقرار رکھتی ہے یا یہ اندر سے طاقت کے مراکز کے مابین لڑے جانے والے نظام کے قریب تر ہو چکی ہے جب کہ عملی طور پر بالادستی کے ایک ہی انداز کے گرد متحد ہے، چاہے چہرے اور بیانیے کتنے ہی کیوں نہ بدل جائیں۔

تشخص کا بحران یا قانونی حیثیت کا بحران؟

موجودہ بحران کا تعلق صرف اسرائیل کے میڈیا امیج سے نہیں ہے بل کہ یہ دنیا کے سامنے اس کی ہستی کی قانونی حیثیت کو چھوتا ہے۔ اسرائیل کے بارے میں مغربی بحث اب صرف میڈیا امیج یا سیاسی ساکھ کے انتظام کے گرد نہیں گھوم رہی ہے بل کہ آہستہ آہستہ مغربی اخلاقی اور سیاسی نظام کے اندر اس کی پوزیشن کی نئی تعریف کی طرف بڑھ رہی ہے۔ غزہ پر نسل کشی کی جنگ کی تصاویر کے مسلسل جمع ہونے نے، جس کے ساتھ دنیا کی نظروں کے سامنے شہریوں کے مسلسل بڑے پیمانے پر قتل عام، بچوں کو بڑے پیمانے پر نشانہ بنانا، جیلوں کے اندر خلاف ورزیاں اور عوامی تذلیل کے مناظر شامل ہیں، مغربی کنارے

میں آبادکاروں کے تکبر اور فلسطینیوں اور یروشلم میں مسیحی مقدسات پر ان کے حملوں کے ساتھ مل کر اسرائیل کو ''وہ اتحادی جس پر تنقید احتیاط کے ساتھ کی جاتی ہے'' کی پوزیشن سے ہٹا کر ''ایک ایسی فائل جو مغربی ڈھانچے کے اندر ایک بڑھتا ہوا اخلاقی دباؤ پیدا کرتی ہے'' کی پوزیشن پر منتقل کرنے میں حصہ ڈالا، جس نے مغربی حکومتوں کو انسانی حقوق کے بیانیے اور سیاسی اتحاد کے عمل کے درمیان بڑھتے ہوئے تضاد کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

یہ تبدیلی کوئی ہنگامی لمحہ نہیں تھی بل کہ اس نے ایک ایسی اجتماعی یادداشت کو دوبارہ زندہ کر دیا جو نسل کشی کی جنگ سے پہلے کے ہولناک مناظر سے بوجھل تھی، لیکن عوامی شعور میں مضبوط موجودگی حاصل کرنے کے لیے واپس آ گئی، جیسے کہ صحافی شیریں ابو عاقلہ کے جنازے پر ان کے تابوت پر حملہ، دوابشہ خاندان کا جلایا جانا، ابراہیمی مسجد پر دھاوا، صابرا اور شاتیلا کے قتل عام، اس کے علاوہ اسرائیلی فوجیوں اور آبادکاروں کی دستاویزی تصاویر جو قتل اور توہین کو ایک عام عمل یا یہاں تک کہ فخر کے موضوع کے طور پر لیتے ہیں۔ ان حقائق کے جمع ہونے کے ساتھ موجودہ واقعات اب الگ تھلگ نہیں لگتے، بل کہ رویے کے ایک وسیع ڈھانچے کی توسیع معلوم ہوتے ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ مختلف شکلوں میں خود کو دہراتا ہے۔

یہ تبدیلی صرف سرکاری اداروں یا روایتی میڈیا کے اندر سے نہیں آئی بل کہ ایک وسیع اور بے مثال مغربی عوامی تحریک کی وجہ سے گہری ہوئی جو سڑکوں، یونیورسٹیوں اور متبادل میڈیا پلیٹ فارمز پر نکل آئی اور روایتی سرکاری بیانیے کی اجارہ داری سے باہر، فلسطینی کاز کو دوبارہ عوامی بحث کے مرکز میں لے آئی۔ یہ تحریک اب معمولی نہیں رہی بل کہ سیاسی اور میڈیا اشرافیہ پر ایک دباؤ ڈالنے والا عنصر بن گئی ہے جو انہیں آہستہ آہستہ اسرائیل کے لیے غیر مشروط حمایت کی حدود پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر رہی ہے، خاص طور پر فیلڈ کے اندر کیے جانے والے اقدامات اور روایتی مغربی سیاسی بیانیے کے درمیان بڑھتے ہوئے فرق کے ساتھ۔

اس تناظر میں، امریکہ کے اندر اسرائیل پر تنقید کرنے میں زیادہ جرات مندانہ میڈیا آوازیں ابھریں، ان میں امریکی میڈیا شخصیت ٹکر کارلسن بھی شامل ہیں، جنہوں نے اسے ''دنیا کا سب سے پرتشدد ملک'' قرار دیا اور اس پر مشرق وسطیٰ میں افراتفری پھیلانے کا الزام لگایا، اس کے ساتھ ساتھ اس کے لیے امریکہ کی غیر مشروط حمایت کے جاری رہنے پر تنقید کی۔ میڈیا اور گلی کوچوں میں یہ تبدیلیاں ''تنقیدی تحفظات'' کے مرحلے سے ''عوامی جوابدہی'' کے مرحلے کی طرف بتدریج منتقلی کی عکاسی کرتی ہیں جس سے مغربی حکومتوں پر دباؤ گہرا ہو رہا ہے جو اپنے آپ کو ایک ایسی عوامی رائے عامہ کے سامنے پاتی ہیں جو اب یہاں تک کہ اعلانیہ اقدار اور اصل پالیسیوں کے درمیان تضاد کو قبول نہیں کرتی۔

اس طرح اسرائیل اب مغربی خارجہ پالیسی میں صرف ایک سیاسی فائل نہیں رہا بل کہ ایک ایسے اخلاقی بوجھ میں تبدیل ہونا شروع ہو گیا ہے جو خود مغربی بیانیے کے اندرونی توازن کو الجھا دیتا ہے اور ایک طرف اسٹریٹجک وعدوں اور دوسری طرف انصاف اور انسانی حقوق کے بڑھتے ہوئے مطالبات کے درمیان بڑھتے ہوئے تضاد کو سنبھالنے کی سیاسی اور میڈیا نظاموں کی صلاحیت کی حدود کو بے نقاب کرتا ہے۔

ایک بے نقاب کرنے والا لمحہ:

''فریڈم فلوٹیلا'' کے واقعے کی اہمیت اس بات میں ہے کہ اس نے کوئی نیا سچ پیش نہیں کیا جتنا کہ اس نے ایک پرانی تصویر کو دوبارہ براہ راست نظروں کے سامنے پہنچا دیا، چناں چہ فلسطینیوں کی تکالیف انسانی حقوق کی رپورٹوں اور دستاویزی گواہیوں کے دائرے سے نکل کر اس عوامی بین الاقوامی منظر نامے پر منتقل ہو گئیں جسے وضاحت یا تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ جس تصویر نے یورپ میں غم و غصے کی لہر دوڑائی وہ اس چیز کا ایک گہرا اور محدود عکس ہے جسے فلسطینی جیلوں، چوکیوں اور محاصرے کے تحت غیر متناسب تنازع کی طویل دہائیوں سے روزانہ دہرائی جانے والی ایک وسیع حقیقت کے طور پر بیان کرتے ہیں۔

موجودہ بحران کوئی الگ واقعہ یا عارضی سفارتی تنازع نہیں لگتا بل کہ ایک ایسے نظری اور اخلاقی جمع ہونے کی ایک نئی کڑی ہے جس نے الگ الگ واقعات کو ایک وسیع تر بیانیے کے اندر جوڑنا شروع کر دیا ہے۔ اس قسم کا ہر واقعہ اب اپنے طور پر نہیں دیکھا جاتا بل کہ ایک دہرائے جانے والے پیٹرن کے حصے کے طور پر پڑھا جاتا ہے جو تذلیل اور ضرورت سے زیادہ طاقت کے استعمال کے مناظر کو دوبارہ پیش کرتا ہے، جس سے بین الاقوامی شعور میں یہ احساس پختہ ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ حالات کے استثنیٰ نہیں ہیں بل کہ رویے کا ایک ڈھانچہ ہے جو وقت کے ساتھ مختلف شکلوں میں دہرایا جاتا ہے۔

اس لیے یہ لمحہ ایک بے نقاب کرنے والا لمحہ معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ یہ کچھ نیا ظاہر کرتا ہے بل کہ اس لیے کہ یہ جواز اور تشریح کی ان تہوں کو ہٹا دیتا ہے جو بیانیے کو حقیقت سے الگ کر رہی تھیں۔ تصاویر اور مناظر کی وسیع پیمانے پر گردش اور بین الاقوامی ردعمل کے جمع ہونے کے ساتھ طاقت اور محکوم بنانے کی ذہنیت دنیا کی عوامی رائے عامہ کے سامنے زیادہ بے نقاب ہو گئی ہے، یہاں تک کہ اب اسے ''جمہوریت'' اور ''سیکیورٹی'' کے بیانیے کے اندر محدود کرنا ممکن نہیں رہا جب کہ تذلیل کے یہ مناظر خود اس بیانیے کا ایک مستقل حصہ بن چکے ہیں جو بین الاقوامی فضا میں اسرائیل کا تعاقب کرتا ہے۔

ابلاغی پروپیگنڈے کی حد اور حقیقت کا ظہور:

''فریڈم فلوٹیلا'' کا یہ پورا واقعہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ مابعدِ جدید دور (Post-modern era) میں ابلاغی کنٹرول اور پروپیگنڈے کے ذریعے زمینی حقائق کو مستقل طور پر چھپانا ممکن نہیں رہا۔ اسرائیل اس وقت محض تشخص کے بحران (Image Crisis) سے نہیں بل کہ اپنے وجودی جواز کے بحران (Legitimacy Crisis) سے گزر رہا ہے۔ جب مغربی رائے عامہ، نامور صحافی (جیسے ٹکر کارلسن اور نکولس کرسٹوف) اور خود ہارتز جیسے اسرائیلی اخبارات اس ساختیاتی تشدد کو ''ریاستی عقیدے'' کے طور پر تسلیم کرنے لگیں تو وہ اخلاقی تحفظاتی ڈھال (Moral Shield) ٹوٹ جاتی ہے جو دہائیوں کے سیاسی اتحاد کا حاصل تھی۔

یہ لمحہ ایک 'انکشافی لمحہ' (Revealing Moment) ہے، یہ طاقت کے اس زوال کی نشاندہی کرتا ہے جہاں طاقتور اب اپنے جبر کو کسی آفاقی قدر (مثلاً جمہوریت یا دفاع) کے لبادے میں چھپانے کے قابل نہیں رہا بل کہ اس کا تذلیل آمیز رویہ ہی اس کا اصل چہرہ بن کر دنیا کے سامنے آ چکا ہے۔ تاریخ کا یہ جبرِ مسلسل اب اس نہج پر پہنچ چکا ہے جہاں مغربی دارالحکومتوں کے لیے اپنے تزویراتی (Strategic) مفادات اور انسانی حقوق کے اعلانیہ اصولوں کے تضاد کو برقرار رکھنا ناممکن ہوتا جا رہا ہے اور یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے اسرائیل کے عالمی تنہا پن کا ایک نیا اور ناگزیر باب شروع ہوتا ہے۔

خصوصی رپورٹ: ابوالعین

غزہ میں نسل کشی تاحال جاری ہے

اسرائیل کے لیے کوئی بھی جنگ بندی بے معنی ہے۔ اس وقت صہیونی ٹولہ اس نظریے پر کام کر رہا ہے کہ اس نے زیادہ سے زیادہ اور ہر طرف تباہی اور بربادی پھیلانی ہے۔ اس کے لیے خواہ تل ابیب تباہ ہو یا بیت المقدس۔ اس ٹولے کو ہر طرف آگ نظر آنی چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صہیونی چاہتے ہیں کہ جس قدر ممکن ہو اور تباہی آئے، اسی قدر جلدی میں مسیح دجال آئے گا۔ مسلمان سمجھتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام آئیں گے اور دجال کا مقابلہ کر کے اسے ختم کریں گے۔

چناں چہ ایک طرف مسیح الدجال کے آنے کی راہ ہموار کی جا رہی ہے تو دوسری طرف پرامن طریقے سے، جب مسیح علیہ السلام زمین پر واپس آئیں گے، تو اس کے لیے سلامتی کی راہیں استوار کی جائیں۔ شام پر صہیونی اسرائیل کے بار بار حملوں کی ایک وجہ یا جواز یہ بھی ہے کہ وہ مسیح علیہ السلام کے زمین اترنے اور ساری کائنات کی عنان حکومت سنبھالنے دمشق کی جامعہ مسجد کے مینار پر نزول فرمائیں گے اور شریعت محمدیؐ کے تسلسل کو چالیس سال برقرار رکھیں گے۔

اس لیے بھی اور یہی وجہ بھی ہے کہ نیتن یاہو کا عقیدہ ہے کہ یہ سب کچھ ہونے کا یہی وقت ہے۔ اس میں پانچ، دس سال لگ سکتے ہیں لیکن اس کے مطابق اسی طرح سے ہونا ہے۔

اب آخری جنگ بندی غالباً اکتوبر 2025ء میں ہوئی تھی جس میں (Art of Deal) کتاب کے مصنف اور امریکی صدر ڈونلڈ جے ٹرمپ کے بیس نکاتی ایجنڈے پر ہوئی تھی۔ اس جنگ بندی نے بنیادی طور پر یہ کام کیا کہ غزہ میں جاری نسل کشی (Genocide) پر امریکہ، اسرائیل اور دنیا بھر میں شدید مظاہرے ہو رہے تھے۔ سیاسی، سفارتی اور تجارتی اعتبار سے اسرائیل کو شدید نقصان پہنچ رہا تھا۔ دنیا بھر میں سخت تنقید کا سامنا تھا، اسے روکنے کے لیے صہیونیت کے سرپرست امریکہ نے صدر ٹرمپ کی ہدایات، سٹیو وٹکاف، جیریڈ کشنر اور عرب ممالک کے ایک گروہ نے کام کیا۔ حماس کو یہ منصوبہ ضرر رساں ہونے کے باوجود اس لیے قبول کرنا پڑا تاکہ غزہ میں نسل کشی رک سکے، جنگ کے نام پر ہونے والے یکطرفہ حملوں کو روکا جائے۔ مغربی کنارے کی اسرائیل میں ضم کرنے کے مقاصد کو روکا جائے۔

اس سارے عمل میں یہ توقع پوری نہ ہو سکی کہ اس پلان میں ثالث بننے والے مسلم حکمرانوں کو آمادہ کیا جا سکے کہ وہ اس ظلم و جارحیت کو روکنے میں بھی کردار ادا کر سکیں۔ مصر کے شہر شرم الشیخ میں معاہدے پر عمل درآمد کے نکات طے کیے گئے لیکن یہ سب کچھ حکمرانوں کے تصویری سیشن اور دنیا کو دکھانے کے لیے کیا گیا۔

چناں چہ جنگ بندی ہوگئی۔ اسرائیل کی فوج کو غزہ سے نکالنے کے بجائے ایک ییلو لائن تک محدود کیا گیا۔ اس طرح یہ فوج پورے غزہ پر ایک طرح سے قابض رہی۔ اس دوران میں 854 فلسطینی بڑی بے دردی سے شہید کر دیے گئے۔ ان کے علاوہ 2,453 فلسطینی زخمی کر دیے گئے۔ اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ ان سطور کے سامنے آنے تک مزید کتنے شہید و زخمی کر دیے جائیں گے۔ لیکن اب دنیا خاموش ہوگئی ہے، مسلم ممالک خاموش تھے، اب وہ اس امن پلان کے پردے میں ابراہام معاہدوں کے پس منظر میں مزید مہر بلب ہو چکی ہے۔

ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ 10 اکتوبر 2025ء کو ہونے والی نام نہاد جنگ بندی

کے بعد تقریباً ہر روز صہیونی فوج نے غزہ میں نسل کشی کا کام جاری رکھا ہوا ہے۔ لیکن اب مظاہروں کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ 10 اکتوبر 2025ء کو جنگ بندی کے بعد ہر روز حملوں کی تعداد 2,400 سے زیادہ ہو چکی ہے۔ یہ حملے فضائی بھی ہیں، ان میں جنگی مشینری میں جہازوں کے ساتھ ساتھ ڈرونز، کواڈ کاپٹرز اور نامعلوم مقدار میں ماہر سنائپر بھی شامل ہیں۔ اسرائیل کی سرپرستی میں کچھ دہشت گرد گینگز بھی قتل و غارت کر رہے ہیں۔ یہ ایک کام اور کرتے ہیں کہ اسرائیل جن امدادی ٹرکوں کو غزہ میں داخل ہونے دیتا ہے، یہ ان کا سامان لوٹ لیتے ہیں۔ اسرائیل کی قید سے تمام فلسطینی قیدی رہا کر دیے جائیں گے۔ حماس کی فہرست کے مطابق زندہ قیدی 2000 تھے جب کہ اسرائیلی تشدد سے فوت ہو جانے والوں کی درست تعداد معلوم نہ تھی۔

اسرائیلی فوج ییلو لائن سے پرے چلی جائے گی۔

اس معاہدے کے ثالثوں میں مصر، قطر اور ترکیہ شامل تھے جب کہ اس معاہدے پر دستخطوں کی تقریب میں 30 سے زیادہ ممالک نے شرکت کی۔ پاکستان کی نمائندگی ہر وقت رکوع کی حالت میں رہنے والے وزیراعظم میاں شہباز شریف نے کی جو ڈونلڈ ٹرمپ کے ہاتھوں میں اپنے ہاتھ زبردستی دیتے اور ان سے باقاعدہ چھیاں ڈالتے پائے گئے۔

اس تقریب میں بنیادی فریق اسرائیل اور حماس موجود نہیں تھے۔ اسی سے وہاں ایسے شکوک کا اظہار کیا گیا تھا کہ اس معاہدے پر عمل شاید ہی ممکن ہو سکے۔ اسرائیل کا قبضہ ختم ہو سکے۔ اٹھارہ برس سے جاری اسرائیل کا محاصرہ اور ناکہ بندی ختم ہو سکیں۔ فلسطینیوں کے لیے ہمسایہ مصر کسی گرم جوشی کا مظاہرہ ہی کر سکے۔

اسرائیل نے بڑے کھلے الفاظ میں کہا کہ وہ کسی بھی صورت میں ایک فلسطینی ریاست بننے نہیں دے گا۔ دوسری طرف امریکہ نے بھاری مقدار اور تعداد میں اسلحہ اور گولہ بارود کی ترسیل اسرائیل کو جاری رکھی۔ سفارتی محاذ پر اس نے اسرائیل پیٹھ ٹھونکے رکھی۔ ہر عالمی فورم پر اسرائیل کو بچانے کے لیے ویٹو کیا۔ ٹرمپ اس دوران میں اس معاہدے اور مسئلے پر لایعنی اور بے مقصد بیانات دیتے رہے۔

اسرائیلی حملے نہ رک سکے: الجزیرہ کے ایک تجزیے کے مطابق اسرائیل نے 214 دنوں میں 190 دن ہر طرح کے حملے کیے۔ صرف 24 دن ایسے تھے جب اسرائیل نے حملہ نہ کیا ہو۔ اس کے باوجود ٹرمپ کہتے رہے کہ اب کسی قسم کے حملے نہیں ہو رہے۔ فلسطین کی وزارت صحت کے مطابق 10 اکتوبر کے بعد ہونے والے حملوں میں 154 فلسطینی مارے گئے جب کہ 2453 زخمی ہوئے۔ ان زخمیوں کی ایک بڑی تعداد شہید ہو گئی۔

اسرائیل نے 19 اکتوبر 2025ء کو الزام عاید کیا کہ حماس کے القسام بریگیڈ نے رفاہ کے علاقے میں، جو اسرائیل کے زیر انتظار ہے، حملہ کر کے اپنی موجودگی کا ثبوت دیا۔ حماس نے کہا کہ رفاہ اسرائیل کے قبضے میں ہے اور وہاں حماس کا کوئی جنگجو یا مجاہد ہی نہیں ہے۔

29 اکتوبر کو اسرائیل نے بلا اشتعال حملہ کر کے 209 افراد کو شہید کر دیا۔ ان میں 52 بچے بھی تھے۔ اس پر اسرائیل نے جواب دیا:

''اسرائیل نے اسی طرح جوابی فائر کیا ہے جس طرح حماس جوابی فائر کرتا ہے۔'' صدر ٹرمپ نے فوراً بیان دیا کہ مذکورہ حملہ اسرائیل نے ایک اسرائیلی کے مارے جانے پر انتقام کے طور پر کیا۔ اسرائیل کا حملہ درست تھا۔

پھر 22 نومبر کو اسرائیل نے ڈرونز اور میزائیلوں سے شمالی اور وسطی غزہ پر بڑا حملہ کیا۔ غزہ کی وزارت صحت کے مطابق 7 اکتوبر 2025ء سے 11 مئی تک اسرائیلی حملوں کی درست تعدادیوں رہی:

مصدقہ افراد کی شہادت۔۔	72,724 فلسطینی
زخمی افراد کی تعداد۔۔	172,555
شہید کیے گئے بچوں کی تعداد۔۔	20,179

اسرائیل اس بات کو مانتا ہے کہ معاہدے کے زیر اثر غزہ میں پورے اعداد جانا ضروری ہے لیکن وہ اس بارے میں مختلف تاویلیں پیش کرتا ہے۔

حکومت غزہ کے میڈیا آفس کے مطابق 10 اکتوبر 2025ء سے 14 فروری 2026ء تک غزہ میں 110,400 امدادی ٹرک کے بجائے صرف 41,714 یعنی 46 فیصدی امداد بھی نہ جا سکی۔ بعض ذرائع کے مطابق 37 فیصد امداد جانے دی گئی۔

اسرائیل نے لازمی غذائیت کی اشیاء کو رفاہ پر ہی روکے رکھا ان میں گوشت، ڈیری اور سبزیات روک لی گئیں۔ ان اشیاء کے مسلسل روکے جانے سے ضروری غذائیت کا توازن بگڑ گیا جس کے فلسطینی عوام پر تباہ کن اثرات مرتب ہوئے۔ سیز فائر ڈیل کے زیر اثر 13 اکتوبر کو حماس نے باقی رہ جانے والے تمام یرغمالی رہا کر دیے اور اس کے 250 قیدی رہا کیے گئے اسرائیلی جیلوں میں طویل مدت کی قید والے 1700 فلسطینی غائب کر دیے گئے۔ معاہدے کے تحت حماس نے 360 فلسطینی قیدیوں کے بدلے میں 28 یرغمالی رہا کرنا تھے۔ حماس نے معاہدہ کے تحت ان کو اسرائیل کے حوالے کر دیا۔ ان میں فوت ہو جانے والے یرغمالی بھی شامل تھے۔ اسرائیل نے 300 فلسطینی قیدی جیلوں میں تشدد سے مار دیے۔ ان کو شدید تشدد سے مارنے کے علاوہ ان کی لاشیں مسخ کر دی گئی تھیں۔

حماس نے 26 دسمبر تک 28 باقی رہ جانے والے یرغمالیوں کی میتیں بھی واپس کر دی۔ لائیر انسٹی ٹیوٹ کے مطابق جنگ بندی کا مقصد یہ تھا کہ لڑائی روک دی جائے گی۔ یہ بھی کہا گیا کہ تنازعے کو امن عزیز تر مطلوب تھا۔ لیکن اسرائیل نے سب باتوں کے خلاف کرتے ہوئے شدید اور جان لیوا حملے جاری رکھے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے فیصلوں کے تحت 10 اکتوبر کے بعد کسی کی ہلاکت بھی بین الاقوامی قانون کی محض پامالی نہیں، شدید نوعیت کی نسل کشی تھی۔ اسرائیل اس سے کبھی بھی باز نہ آیا۔

تجزیہ: ڈیوڈ کرونن

انسانی حقوق یا منافع؟ یورپی یونین کا اسرائیل کے ساتھ جاری مشکوک اشتراک

جب یورپی یونین نے اعلان کیا کہ وہ ان لوگوں پر پابندیاں عائد کرے گی جنہیں پریس ''پرتشدد اسرائیلی آبادکار'' کہتی ہے، تو کہیں بھی جشن نہیں منایا گیا۔ ان اقدامات کی سب سے مثبت تشریح یہ ہوسکتی ہے کہ انہیں احتساب کی جانب ایک ممکنہ قدم، چاہے وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، سمجھا جائے۔

اگر ان اقدامات کے بعد بامعنی کارروائی کی گئی اور یہ ایک بہت بڑا ''اگر'' ہے تو یورپی یونین بالآخر اسرائیل کو بین الاقوامی قانون کے بنیادی اصولوں کو پامال کرنے کی قیمت چکانے پر مجبور کرے گی۔ پیر کے روز اس فیصلے پر وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو اور ان کے اتحادی ساتھیوں نے جس غصے کا اظہار کیا، وہ بلاشبہ اسرائیلیوں میں تنہائی کے وسیع تر خوف کی عکاسی کرتا ہے۔

اس کے باوجود، یورپی یونین کی پابندیوں کی تشکیل انتہائی مسائل زدہ ہے۔ ''پرتشدد'' آبادکاروں پر توجہ مرکوز کرنے سے یہ غلط تاثر ملتا ہے کہ مقبوضہ مغربی کنارے میں رہنے والے زیادہ تر اسرائیلی پرامن اور قانون پسند ہیں۔ صرف چند آبادکار تنظیموں اور افراد پر توجہ مرکوز کرنا جیسا کہ یورپی یونین نے کیا ہے، اس حقیقت کو نظرانداز کرتا ہے کہ نوآبادیاتی منصوبہ بنیادی طور پر ہی پرتشدد ہے۔

''متوازن'' دکھائی دینے کی کوشش میں، یورپی یونین نے ''پرتشدد'' آبادکاروں پر اپنی پابندیوں کے ساتھ ''حماس کے سرکردہ رہنماؤں'' کو نشانہ بنانے والے نئے اقدامات بھی شامل کیے ہیں۔

اس طرح حقیقت کو مسخ کر دیا گیا ہے۔ قبضے میں رہنے والے فلسطینیوں پر اسرائیلیوں کے حملے اور قبضے کو ختم کرنے کے خواہاں فلسطینیوں کی مسلح مزاحمت کو ایک جیسا سمجھا جا رہا ہے۔ یورپی یونین کی خارجہ پالیسی کی سربراہ کاجا کالس (Kaja Kallas) ظالم اور مظلوم کو ایک صف میں کھڑا کرنے کی مجرم ہیں۔ انہوں نے پیر کے روز انتہا پسندی کے ''نتائج'' کے بارے میں خبردار کیا اور اس میں حماس اور اسرائیلی آبادکاروں کی جانب سے ''فلسطینیوں کے خلاف تشدد'' دونوں کی طرف اشارہ کیا۔

انہوں نے دعویٰ کیا کہ اپنے اس فیصلے کے ذریعے، یورپی یونین ''تعطل سے عملی اقدامات'' کی جانب منتقل ہوگئی ہے۔ ان کا یہ تبصرہ یقینی طور پر ہنگری کے لیے تھا۔

اپنے حالیہ انتخابی شکست سے پہلے، وکٹر اوربان (Viktor Orbán) نے یورپی یونین کو ان پابندیوں کی منظوری دینے سے روک رکھا تھا جن پر اس ہفتے باقاعدہ مہر ثبت کر دی گئی۔ اب جب کہ پیٹر میگیار (Péter Magyar) نے اوربان کی جگہ وزیراعظم کے طور پر لے لی ہے، ہنگری شاید اب غیر معمولی ملک نہ رہے بلکہ یورپی یونین کے مرکزی دھارے کے قریب آجائے۔

وقت ہی بتائے گا کہ کیا مرکزی دھارے کا موقف اسرائیل کے ریاستی تشدد، نہ کہ صرف آبادکاروں کے تشدد کی مخالفت کرنا بن جائے گا اور یہ مخالفت صرف الفاظ سے نہیں بلکہ عملی اقدامات سے ہوگی۔ جرمنی اور اٹلی نے اب تک دیگر یورپی حکومتوں کی جانب سے اسرائیل سے تجارتی مراعات واپس لینے اور تعاون معطل کرنے کی کوششوں کو ناکام بنایا ہے۔

''کیش کاؤ'' (منافع کا ذریعہ)

جب تک یہ تعاون ختم نہیں ہوتا، یورپی یونین اسرائیلی ''جدت پسندوں'' کے لیے ایک منافع بخش ذریعہ (کیش کاؤ) بنی رہے گی، جن میں سے بیشتر، اگر تمام نہیں، تو مغربی

کنارے اور غزہ پر قابض فوج سے گہرے روابط رکھتے ہیں۔

مثال کے طور پر، تل ابیب میں قائم فرم 'سائبر رج' (CyberRidge) کو حال ہی میں یورپی یونین کی جانب سے تقریباً 3 ملین ڈالر کی سائنسی تحقیقی گرانٹ ملی ہے۔

کمپنی کی اپنی ویب سائٹ کے مطابق، سائبر رج ''دہائیوں کی تعلیمی تحقیق کو فرنٹ لائن انٹیلیجنس کے تجربے'' کے ساتھ ملاتی ہے اور ''دنیا کے انتہائی حساس ڈیٹا کو انٹرسپشن، نگرانی اور کوانٹم دور کی ڈکرپشن'' سے محفوظ رکھتی ہے۔ اور یہ فرم ''ڈیپ ٹیک، دفاع اور تجارتی اثرات پر مرکوز سرمایہ کاروں کے متنوع اتحاد'' کی حمایت سے لطف اندوز ہوتی ہے، جہاں ''دفاع'' دراصل ہتھیاروں اور جنگ سے متعلق ہر چیز کے لیے ایک خوشنما نام ہے۔

سائبر رج کے ''انٹیلیجنس تجربے'' کی مزید تفصیلات اس کے کلیدی کرداروں کے کیریئر کو دیکھ کر معلوم کی جاسکتی ہیں۔

شیرا کپلن (Shira Kaplan) نے حال ہی میں سائبر رج میں ''ایگزیکٹو ایڈوائزر'' کے طور پر شامل ہونے پر اپنی خوشی کا اظہار کیا تاکہ وہ جرمنی، آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ میں اس کی مصنوعات کو فروغ دے سکیں۔ اگرچہ اب زیورخ سے کام کر رہی ہیں، کپلن اسرائیل کی ملٹری ''یونٹ 8200'' کی فخر کے ساتھ گریجویٹ ہیں، جو فلسطینیوں کی جاسوسی کرنے پر مامور ہے۔

اس فرم میں ایسی پس منظر کی حامل واحد نمائندہ وہ نہیں ہیں۔ یائرون بین شلوش (Yaron Ben-Schlusch)، جو فرم کے سیلز کے نائب صدر ہیں، وہ بھی یونٹ 8200 کے سابق طالب علم ہیں۔

سائبر رج کو گرانٹ دے کر، یورپی یونین ایک ایسی فرم کی مدد کر رہی ہے جو اسرائیل کے تربیت یافتہ جاسوسوں کو ملازمت دیتی ہے اور خود کو ''دنیا کے انتہائی حساس ڈیٹا'' کی حفاظت کے لیے قابل اعتماد کے طور پر مارکیٹ کرتی ہے۔

دریں اثنا، اسرائیل کی ٹیکنین (Technion) یورپی یونین کے تحقیقی پروگرام سے فائدہ اٹھاتی رہتی ہے۔

مارچ سے، ٹیکنین نے کم از کم چار ایسے پروجیکٹس شروع کیے ہیں جنہیں یورپی یونین کی فنڈنگ حاصل ہے، جن کی کل مالیت 9 ملین ڈالر سے تجاوز کر گئی ہے۔

ایک عوامی یونیورسٹی ہونے کے دعوے کے باوجود، ٹیکنین نے اس ہفتے ایک بار پھر ہتھیاروں کی صنعت کے ساتھ اپنے مضبوط بندھن کا مظاہرہ کیا جب فرم 'رافیل' (Rafael) نے اس کے کیمپس میں ایک تقریب کو اسپانسر کیا۔ حاضرین سے ایک ''معلوماتی لیکچر'' اور ''ہمارے دلچسپ کام کی جھلک دیکھنے'' کے موقع کا وعدہ کیا گیا تھا۔

رافیل کا ''دلچسپ کام'' آئرن ڈوم سسٹم میں سب سے بڑا حصہ ڈالنا ہے۔

آئرن ڈوم کو دراصل 'آئرن گرپ' (لوہے کی گرفت) کہا جانا چاہیے تھا۔ اس منصوبے کا ضمنی مقصد غزہ پر اسرائیل کی گرفت برقرار رکھنا ہے، جبکہ وہاں سے فائر کیے جانے والے میزائلوں کو راستے میں ہی روکنا ہے۔

برسلز کے حکام کو بہت اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ ٹیکنین ان ہتھیار سازوں کے لیے لیبارٹریز کی میزبانی کرتی ہے جو بڑے پیمانے پر ناانصافی اور حتیٰ کہ نسل کشی سے منافع کماتے ہیں۔ ان کا ٹیکنین کو گلے لگانا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ انسانیت کے خلاف مستقبل کے جرائم کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔

چند ''پرتشدد آبادکاروں'' پر پابندی لگانا ان جرائم کا مداوا نہیں کر سکے گا۔

اس مضمون میں جن اداروں اور کمپنیوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کا مختصر تعارف اور تناظر درج ذیل ہے:

سائبر رج (CyberRidge)

یہ تل ابیب میں قائم ایک نجی ٹیکنالوجی کمپنی ہے۔ یہ کمپنی ''ڈیپ ٹیک'' (Deep Tech) اور ''دفاعی'' شعبوں میں کام کرتی ہے۔ اس کا اصل کام جدید انٹیلیجنس، ڈیٹا کی حفاظت، نگرانی (surveillance) اور کوانٹم کرپٹوگرافی جیسے حساس شعبوں سے متعلق ہے۔ اس کمپنی کا ذکر اس لیے اہم ہے کیونکہ اس کے کلیدی عہدیداران کا تعلق اسرائیل کی بدنام زمانہ ملٹری انٹیلیجنس یونٹ '8200' سے ہے اور اسے یورپی یونین کی جانب سے بھاری تحقیقی گرانٹ دی گئی ہے۔

یونٹ 8200 (Unit 8200)

یہ اسرائیلی فوج (IDF) کا سب سے بڑا اور اہم ترین انٹیلیجنس یونٹ ہے۔ اس کا بنیادی کام سگنل انٹیلیجنس (SIGINT)، کوڈ توڑنا اور جاسوسی کرنا ہے۔ انسانی

حقوق کی تنظیموں اور بین الاقوامی رپورٹس کے مطابق اس یونٹ کو فلسطینیوں کی بڑے پیمانے پر نگرانی اور ان کی نجی زندگی میں مداخلت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس یونٹ کا حوالہ اس لیے دیا گیا ہے تاکہ یہ واضح کیا جا سکے کہ کس طرح ''سابق فوجی جاسوس'' نجی ٹیکنالوجی کمپنیوں میں آ کر اپنے تجربے کو تجارتی اور عسکری مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

ٹیکنین (Technion-Israel Institute of Technology)

یہ اسرائیل کی ایک معروف عوامی یونیورسٹی ہے جو سائنسی اور تکنیکی تحقیق کے لیے عالمی سطح پر تسلیم شدہ ہے۔ تاہم، یہ ادارہ اسرائیل کی عسکری اور ہتھیار سازی کی صنعت (جیسے کہ رافیل) کے ساتھ گہرے روابط کے لیے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ یونیورسٹی عسکری تحقیق اور ٹیکنالوجی کی تیاری میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یورپی یونین اسے ''تعلیمی ادارہ'' سمجھ کر فنڈنگ دیتی ہے، جبکہ حقیقت میں یہ ادارہ ان کمپنیوں کے لیے لیبارٹریز اور ٹیکنالوجی فراہم کرتا ہے جو مقبوضہ علاقوں میں تشدد اور فوجی کارروائیوں میں ملوث ہیں۔

رافیل (Rafael Advanced Defense Systems)

یہ ایک بڑی اسرائیلی دفاعی کمپنی ہے جو جدید ہتھیار، میزائل سسٹم اور عسکری ٹیکنالوجی تیار کرتی ہے۔ اس کا سب سے معروف منصوبہ ''آئرن ڈوم'' (Iron Dome) ہے، جو کہ میزائلوں کو فضا میں تباہ کرنے والا دفاعی نظام ہے۔ یہ کمپنی اسرائیل کی سرکاری دفاعی صنعت کا حصہ ہے اور عالمی سطح پر ہتھیاروں کی برآمدات میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

یورپی یونین کی سائنسی تحقیقی گرانٹس کا نظام بظاہر ایک غیر جانبدار اور خالصتاً سائنسی عمل معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کی پیچیدہ ساخت ہی وہ راستہ ہے جس سے اسرائیلی ادارے فنڈنگ حاصل کرتے ہیں۔ اس عمل کو سمجھنے کے لیے درج ذیل نکات اہم ہیں:

''ہورائزن یورپ'' (Horizon Europe) کا فریم ورک

یورپی یونین کا سب سے بڑا تحقیقی پروگرام ''ہورائزن یورپ'' کہلاتا ہے۔ یہ اربوں یورو کا ایک فنڈ ہے جو دنیا بھر کی یونیورسٹیوں، تحقیقی مراکز اور نجی کمپنیوں کو نئی ٹیکنالوجی اور سائنسی ایجادات کے لیے دیا جاتا ہے۔

اسرائیل کی شمولیت:

اسرائیل اس پروگرام کا ایک ''ایسوسی ایٹڈ ممبر'' ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اسرائیل یورپی یونین کو ایک بڑی رقم ادا کرتا ہے تاکہ اس کے اپنے سائنسدان اور کمپنیاں اس پروگرام میں اسی طرح حصہ لے سکیں جیسے کہ یورپی ممالک کے ادارے لیتے ہیں۔

باہمی معاہدہ:

اس معاہدے کے تحت، اسرائیلی ادارے (جیسے ٹیکنین یا سائبر رج) یورپی یونیورسٹیوں یا کمپنیوں کے ساتھ مل کر پروجیکٹس کے لیے درخواست دے سکتے ہیں۔

انتخاب کا عمل (Selection Process)

جب کوئی ادارہ (مثلاً ایک یورپی یونیورسٹی اور اسرائیلی فرم 'سائبر رج') مشترکہ طور پر گرانٹ کے لیے درخواست دیتے ہیں، تو ماہرین کا ایک پینل اس کی جانچ کرتا ہے۔

سائنسی معیار:

یہاں اہم بات یہ ہے کہ یہ پینل بنیادی طور پر اس بات پر غور کرتا ہے کہ پروجیکٹ کی سائنسی افادیت کیا ہے۔ اس عمل میں اکثر ادارہ جاتی پس منظر (جیسے کہ آیا وہ ادارہ فوج یا جاسوسی کے کاموں میں ملوث ہے) کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی، جب تک کہ وہ ادارہ کسی یورپی پابندیوں کی فہرست میں نہ ہو۔

سول ورسز ملٹری (Dual-use Dilemma):

یورپی یونین کے اصولوں کے مطابق، ''دوہرے استعمال'' (Dual-use) یعنی ایسی ٹیکنالوجی جو سویلین اور فوجی دونوں مقاصد کے لیے استعمال ہو سکے، کی فنڈنگ پر کڑی نگرانی ہونی چاہیے، لیکن ناقدین کا کہنا ہے کہ اسرائیل کے معاملے میں یہ نگرانی بہت کمزور ہے۔

فنڈز کی منتقلی کا طریقہ کار:

جب ایک پروجیکٹ منظور ہو جاتا ہے، تو فنڈز کی منتقلی کچھ اس طرح ہوتی ہے:

1. کنسورشیم (Consortium):

یورپی یونین براہ راست ایک کمپنی کو گرانٹ دینے کے بجائے ایک گروپ کو دیتی ہے جس میں مختلف ممالک کے ادارے شامل ہوتے ہیں۔

2. ادائیگی:

یورپی یونین ان فنڈز کو براہ راست پروجیکٹ کے لیڈر کو یا پارٹنرز کے بینک اکاؤنٹس میں منتقل کرتی ہے۔ اس طرح، اسرائیلی ادارے کو ملنے والی رقم قانونی طور پر ''یورپی ریسرچ فنڈ'' کا حصہ بن جاتی ہے۔

اس نظام کے بارے میں اعتراضات:

اس سسٹم پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ سائنسی اور اخلاقی حدود آپس میں خلط ملط ہو جاتی ہیں۔

معاشی سپورٹ:

جب یورپی یونین کسی اسرائیلی فرم (جیسے 'سائبر رج') کو 3 ملین ڈالر دیتی ہے، تو یہ صرف ایک ریسرچ پروجیکٹ کی سپورٹ نہیں ہوتی، بلکہ یہ اس کمپنی کے انفراسٹرکچر، ملازمین کی تنخواہوں اور ان کی تحقیق کو مستحکم کرتی ہے، جو بعد میں اسرائیل کے عسکری ڈھانچے کے لیے اثاثہ بن جاتی ہے۔

کونسا پیسہ کہاں جاتا ہے؟

ناقدین کا کہنا ہے کہ یورپی یونین یہ دیکھنے میں ناکام رہتی ہے کہ وہ فنڈز جو وہ ''سائنسی تحقیق'' کے نام پر دے رہی ہے، وہ اسرائیلی فوج کی جاسوسی صلاحیتوں کو بڑھانے میں کتنے مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔

یورپی یونین کی فنڈنگ کا نظام اسرائیل کے لیے ایک ''کیش کاؤ'' (منافع بخش ذریعہ) کی طرح ہے کیونکہ اسرائیل اس سسٹم میں مالی شراکت دار ہونے کی وجہ سے ایک ''اندرونی کھلاڑی'' بن چکا ہے۔ اس کی وجہ سے یورپی یونین کی جانب سے عائد کردہ محدود پابندیاں (جیسے کچھ آبادکاروں پر پابندی) ان سائنسی معاہدوں کے سامنے بے اثر نظر آتی ہیں۔

مختصر تجزیہ:

ان تمام اداروں کا ذکر ایک خاص مقصد کے لیے کیا گیا ہے۔ یہ دکھانا کہ کس طرح یورپی یونین کی فنڈنگ اور تعاون صرف ''سائنسی تحقیق'' تک محدود نہیں ہے، بلکہ یہ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ان اسرائیلی اداروں کو مضبوط کر رہا ہے جو اسرائیل کی عسکری اور جاسوسی کی صلاحیتوں میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔

خصوصی رپورٹ: ضیاء چترالی

عراقی صحرا میں اسرائیلی خفیہ اڈہ؟

کیا آپ یقین کریں گے کہ ایک ملک کی سرزمین پر آکر دوسرا ملک اپنی پوری فوجی چھاؤنی تعمیر کر لے، وہاں اپنے خصوصی کمانڈوز، اسلحہ، ہیلی کاپٹر، لاجسٹک نیٹ ورک اور سرچ اینڈ ریسکیو ٹیمیں تعینات کردے، مگر ''میزبان ملک'' کے حکام کو کانوں کان خبر نہ ہو؟ یہ کوئی جاسوسی ناول یا ہالی ووڈ فلم کی کہانی نہیں بلکہ ایک ایسا انکشاف ہے جس نے پورے مشرقِ وسطیٰ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔

امریکی اخبار وال اسٹریٹ جرنل نے اپنی کل 9 مئی کی رپورٹ میں انکشفاف کیا ہے کہ اسرائیل نے ایران کے خلاف فضائی جنگ کی تیاری کے لیے عراق کے مغربی صحرا ''النخیب'' میں ایک خفیہ عسکری اڈہ قائم کر رکھا تھا۔ یہ اڈہ نہ صرف اسرائیلی فضائی کارروائیوں کے لیے استعمال ہو رہا تھا بلکہ وہاں اسرائیلی اسپیشل فورسز، فضائی لاجسٹک یونٹس اور ایسے سرچ اینڈ ریسکیو دستے بھی موجود تھے۔، جن کا مقصد ایران کے اندر اسرائیلی طیارہ گرنے کی صورت میں پائلٹس کو نکالنا تھا۔ یہ اڈہ جنگ شروع ہونے سے کچھ عرصہ قبل تعمیر کیا گیا اور امریکی حکام اس منصوبے سے مکمل طور پر آگاہ تھے۔ بلکہ انکی نگرانی میں اسے قائم کیا گیا۔

وال اسٹریٹ جرنل کے مطابق عراق کے مغربی صحرا کا انتخاب اس لیے کیا گیا کیونکہ یہ علاقہ انتہائی وسیع، ویران اور کم آبادی والا ہے۔ ماضی میں بھی امریکی اسپیشل فورسز 1991 اور 2003 کی جنگوں میں انہی علاقوں کو خفیہ آپریشنز کے لیے استعمال کرتی رہی ہیں۔ امریکی دفاعی ماہر مائیکل نائٹس کے مطابق ایسی عارضی ''فارورڈ آپریٹنگ بیسز'' جدید جنگوں میں معمول کی بات سمجھی جاتی ہیں۔ مگر اصل دھماکہ خیز پہلو وہ واقعہ ہے، جس کا ذکر امریکی اخبار نے تفصیل سے کیا۔ رپورٹ کے مطابق مارچ کے آغاز میں ایک مقامی چرواہے نے صحرا میں غیر معمولی فوجی سرگرمی دیکھی۔ اس نے عراقی حکام کو اطلاع دی کہ وہاں ہیلی کاپٹروں کی پروازیں اور مشکوک نقل و حرکت جاری ہے۔ عراقی فوج نے جب اس مقام کی جانب پیش قدمی کی تو اسرائیلی فضائیہ نے ان پر حملہ کر دیا، جس کے نتیجے میں ایک عراقی فوجی ہلاک اور دو زخمی ہو گئے۔ اس فوجی کے جنازے کی ویڈیو بھی منظر عام پر آچکی ہے۔ عراقی میڈیا نے اُس وقت اس واقعے کو ''نامعلوم غیر ملکی فورسز'' کی کارروائی قرار دیا تھا۔ بعض رپورٹس میں کہا گیا کہ یہ امریکی یا اسرائیلی کمانڈوز تھے، جو شام کی سرحد سے ہیلی کاپٹروں کے ذریعے داخل ہوئے۔ اس واقعے کے بعد بغداد نے اقوام متحدہ میں شکایت بھی درج کروائی، مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ عراق نے ابتدائی طور پر اس حملے کا الزام امریکہ پر لگایا، جبکہ واشنگٹن نے فوراً اس کی تردید کردی۔ اب وال اسٹریٹ جرنل کی رپورٹ سامنے آنے کے بعد پورا منظرنامہ بدلتا دکھائی دے رہا ہے۔

اس خفیہ اڈے کی اہمیت صرف اتنی نہیں کہ یہ اسرائیلی جنگی طیاروں کیلئے لاجسٹک مرکز تھا، بلکہ اس نے اسرائیل کو ایران کے بہت قریب لا کھڑا کیا۔ اسرائیلی طیاروں کو پہلے ہزاروں کلومیٹر دور سے کارروائیاں کرنی پڑتی تھیں، مگر عراق کے اندر موجود اس اڈے نے اسرائیل کے لیے ایران کو ''تھرڈ سرکل'' سے نکال کر تقریباً ''فرسٹ سرکل'' میں تبدیل کر دیا۔

رپورٹ میں یہ بھی انکشاف کیا گیا کہ جب ایران کے قریب ایک امریکی F-15E طیارہ مار گرایا گیا تو اسرائیل نے امریکی پائلٹس کی ریسکیو میں مدد کی پیشکش بھی کی تھی۔ اگرچہ امریکی فورسز نے خود اپنے اہلکار نکال لیے، مگر یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ اسرائیلی اور امریکی آپریشنز کس حد تک ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ اسرائیلی فضائیہ نے ایران کے خلاف پانچ ہفتوں پر محیط جنگ میں ہزاروں فضائی حملے کیے۔ امریکی اخبار کے مطابق اس دوران عراق کے صحرا میں قائم یہ خفیہ اڈہ اسرائیلی فضائی کارروائیوں کے لیے کلیدی مرکز بن چکا تھا۔

یہاں سوال صرف اسرائیلی دراندازی کا نہیں، بلکہ عراق کی ریاستی خودمختاری، اس کے داخلی ڈھانچے اور ایرانی اثر و نفوذ کا بھی ہے۔ عراق کو طویل عرصے سے ایران کا قریبی اتحادی سمجھا جاتا ہے۔ بغداد میں ایرانی اثر و رسوخ اس حد تک مضبوط ہے کہ عراق عملاً تہران کے اسٹریٹجک دائرے میں آچکا ہے۔ عراقی ملیشیاؤں، سیاسی جماعتوں اور سیکورٹی ڈھانچوں پر ایران نواز قوتوں کی گرفت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر عراق واقعی ایران کا قریبی اتحادی اور اس کے اثر و رسوخ کا مرکز ہے تو اسرائیل وہاں اتنا بڑا خفیہ فوجی اڈہ کیسے قائم کر گیا؟ کیا واقعی بغداد کو کچھ معلوم نہیں تھا؟ یا پھر ریاستی اداروں کے اندر ایسی دراڑیں موجود ہیں، جہاں غیر ملکی طاقتیں با آسانی اپنے نیٹ ورک کھڑے کر سکتی ہیں؟ اس سے بھی بڑا سوال یہ ہے کہ کیا عراق اب واقعی ایک خودمختار ریاست رہ گیا ہے یا مختلف عالمی و علاقائی طاقتوں کا کھلا میدان بن چکا ہے؟ ایک طرف ایران نواز ملیشیائیں، دوسری طرف امریکی اڈے، پھر ترک فوجی موجودگی اور اب اسرائیلی خفیہ بیس کے انکشافات۔ آخر عراق میں کون حکومت کر رہا ہے؟

یہ بھی غور طلب ہے کہ اگر اسرائیل عراق کے اندر اتنی گہری عسکری رسائی حاصل کر چکا ہے تو کیا مستقبل میں ایران کے خلاف مزید بڑے آپریشنز بھی عراق کی سرزمین سے کیے جا سکتے ہیں؟ کیا مذاکرات اور جنگ بندی کی باتیں صرف سفارتی پردہ ہیں، جبکہ میدان میں نئی صف بندیاں خاموشی سے مکمل کی جا رہی ہیں؟

امریکی اور اسرائیلی حکمتِ عملی پر نظر رکھنے والے بعض مبصرین کا خیال ہے کہ واشنگٹن "کنٹرولڈ کشیدگی" کی پالیسی پر چل رہا ہے۔ یعنی ایران کو مکمل جنگ میں دھکیلنے کے بجائے مسلسل دباؤ، خفیہ کارروائیوں اور محدود حملوں کے ذریعے کمزور رکھا جائے، تاکہ وہ مذاکرات کی میز پر بھی بیٹھا رہے اور خطے میں اس کی طاقت بھی بتدریج گھٹتی رہے۔

مگر اس ساری صورتحال میں سب سے زیادہ حیران کن کردار عراق کا ہے۔ ایک ایسا ملک جو خود کو ایران کا اتحادی کہتا ہے، جہاں ایران نواز جماعتیں حکومت کا حصہ ہیں، جہاں ایرانی جنرل قاسم سلیمانی برسوں کھلے عام سرگرم رہا، وہاں اسرائیل ایک خفیہ عسکری اڈہ بنا لیتا ہے، اسرائیلی کمانڈوز سرگرم رہتے ہیں، ہیلی کاپٹر اڑتے ہیں، ایران پر بمباری اور عراقی فوج پر حملہ ہوتا ہے اور ریاست کو مکمل حقیقت کا علم بھی امریکی اخبار سے ہوتا ہے؟

یہ سوال اب پورے خطے میں گونج رہا ہے کہ آخر یہ کیا تماشا ہے؟ کیا عراق واقعی بے خبر تھا؟ اگر بے خبر تھا تو یہ اس کی ریاستی ناکامی ہے اور اگر خبر تھی تو پھر یہ خطے کی سیاست کا سب سے بڑا دوہرا کھیل ہے۔ عراق کے صحرا میں قائم اس اسرائیلی اڈے کا انکشاف پورے مشرقِ وسطیٰ کی بدلتی ہوئی جنگی سیاست کا اعلان ہے، ایسی سیاست جہاں اتحادی اور دشمن کی سرحدیں دھندلا رہی ہیں، ریاستیں کمزور ہو رہی ہیں اور خفیہ جنگیں کھلی حقیقت بنتی جا رہی ہیں۔

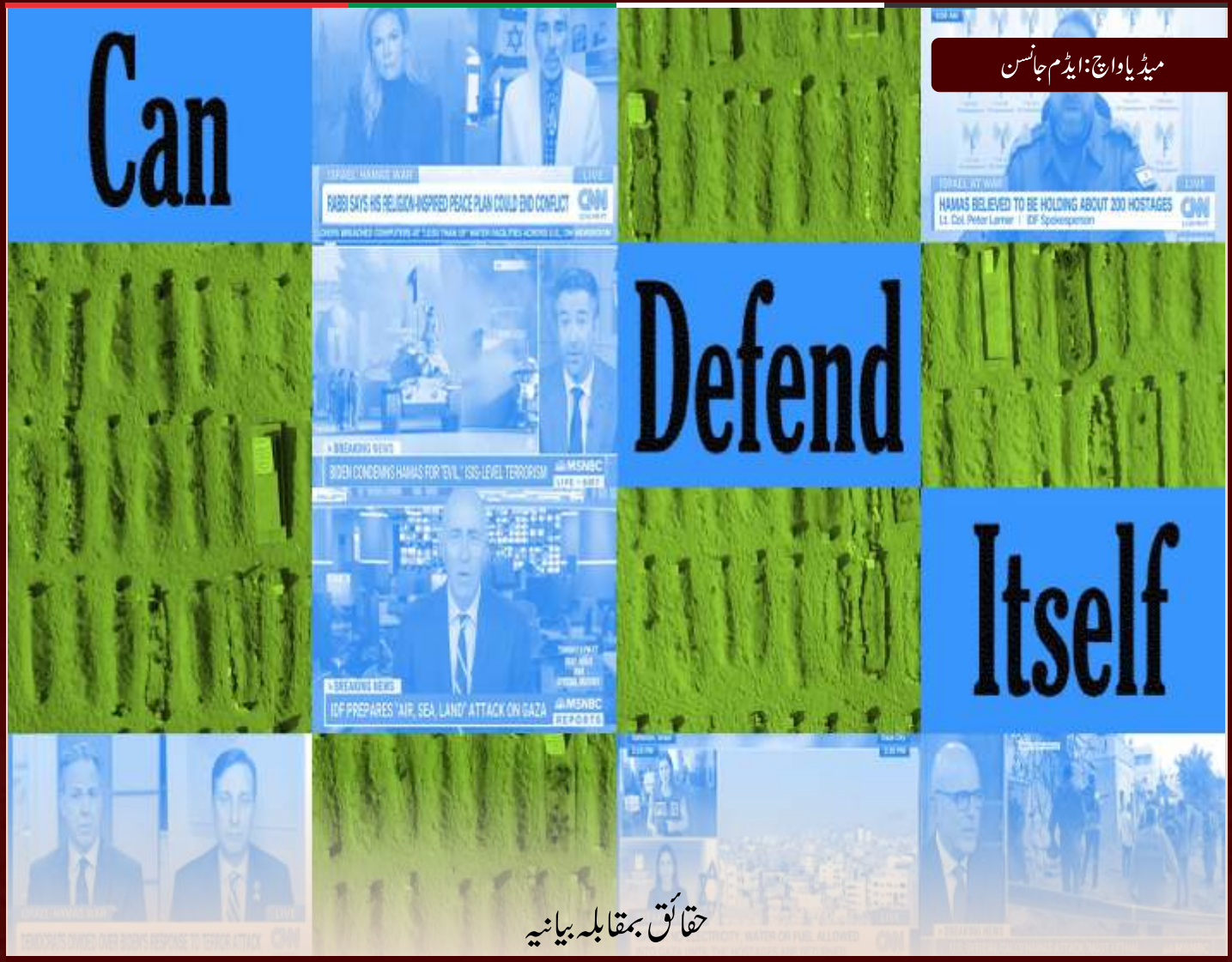

حقائق بمقابلہ بیانیہ

امریکی میڈیا میں اسرائیل نواز تعصب کے ناقابلِ تردید ثبوت

صحافت کا بنیادی فریضہ طاقت کے سامنے سچ بولنا اور انسانی حقوق کی غیر جانبدارانہ وکالت ہے، لیکن غزہ کے حالیہ تنازع نے اس عالمی دعوے پر کئی سوالات کھڑے کر دیے ہیں۔ عام طور پر میڈیا کے تعصب کو ایک جذباتی الزام سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، لیکن جب بارہ ہزار سے زائد اخباری مضامین اور ہزاروں گھنٹوں پر محیط ٹی وی نشریات کا ڈیٹا (Data) سامنے رکھا جائے تو یہ محض الزام نہیں بل کہ ایک لرزہ خیز حقیقت بن کر ابھرتا ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں ان شماریاتی ثبوتوں کا احاطہ کیا گیا ہے جو یہ واضح کرتے ہیں کہ کس طرح امریکی میڈیا کے بااثر اداروں نے زبان، اصطلاحات اور کوریج کے تناسب کے ذریعے ایک منظم بیانیہ تشکیل دیا۔ یہ محض خبروں کی فراہمی نہیں تھی، بل کہ ایک ایسے انسانی المیے کو 'ناگزیر' بنا کر پیش کرنے کی کوشش تھی جسے تاریخ 'نسل کشی' کے نام سے یاد رکھے گی۔

امریکی میڈیا آؤٹ لیٹس غزہ کی نسل کشی کو امریکی عوام کو ''بیچنے'' (درست ثابت کرنے) میں اسرائیل کی مدد کرنے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتے تھے۔

کسی سے بھی پوچھ لیں جس نے تھوڑی سی بھی تنقیدی سوچ کے ساتھ غزہ کے بارے میں خبروں پر نظر رکھی ہو، وہ آپ کو بتائیں گے: میڈیا تنظیمیں فلسطینیوں کے خلاف تعصب رکھتی ہیں اور منظم طریقے سے اسرائیل کی طرفداری کرتی ہیں۔

یہ کہنا آسان ہے لیکن اسے ثابت کرنا مشکل ہے۔ ایسا تجرباتی تجزیہ (empirical analysis) کرنا جو ان تعصّبات کو ظاہر کرے، وقت طلب اور پیچیدہ کام ہے جو ایسی رکاوٹوں اور نزاکتوں سے بھرا ہوا ہے جو تصویر کو دھندلا سکتی ہیں۔ تاہم دوہرے معیار ہر جگہ موجود ہیں اور ایسے سنجیدہ اور کیفیاتی (qualitative) کام کرنے کے طریقے موجود ہیں جو نہ صرف اسرائیلی اور فلسطینی زندگی کی کوریج کے فرق کو واضح کرتے ہیں، بل کہ یہ بھی دکھاتے ہیں کہ دیگر حالیہ تنازعات کو کس طرح کور کیا گیا ہے۔

اپنی نئی کتاب ''نسل کشی کیسے بیچی جائے: غزہ کی تباہی میں میڈیا کی ملی بھگت'' کے لیے، میں نے کسی معقول شک وشبہ سے بالاتر ہو کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غزہ کی جنگ کی امریکی میڈیا کوریج یکطرفہ، نسل پرستانہ، غیر انسانی تھی اور اکثر اوقات کھلم کھلا اشتعال انگیزی (incitement) کی طرف مائل رہی۔

میں نے نیویارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ، سی این این ڈاٹ کام، پولیٹیکو، ایکسیوس، یو ایس اے ٹوڈے اور دی ایسوسی ایٹڈ پریس کے 12000 سے زیادہ مضامین کے ساتھ ساتھ سی این این اور ایم ایس این بی سی پر نشر ہونے والے 5000 ٹی وی سیگمنٹس کا

معائنہ کیا۔ توجہ ان ''سینٹر لیفٹ'' میڈیا آؤٹ لیٹس پر ہے جو تنازع کے پہلے سال کے دوران جو بائیڈن انتظامیہ پر اثر انداز رہے۔ جس میں پہلے چند مہینوں پر خاص زور دیا گیا ہے، جب اسرائیل نے نسل کشی کا جواز پیش کرنے والا اپنا بیانیہ مضبوطی سے قائم کیا، جس نے بڑے پیمانے پر ہونے والی اموات کو ناگزیر بنا دیا۔

یہاں سات شماریاتی نتائج پیش ہیں جو فلسطینیوں کے خلاف امریکی میڈیا کے تعصب کو ثابت کرتے ہیں:

1. اسرائیل کا ''اپنا دفاع کرنے کا حق''

کسی قوم کے ''اپنا دفاع کرنے کا حق'' کا حوالہ دینے کا میڈیا کا شوق، جس کے بعد عام طور پر شہریوں کے بڑے پیمانے پر قتل کی منطقی وضاحت کی جاتی ہے، تقریباً خصوصی طور پر اسرائیل کے لیے محفوظ تھا۔ سی این این اور ایم ایس این بی سی پر مہمانوں، اینکرز اور رپورٹرز نے اسرائیل کے لیے حقِ مدافعت کا ذکر فلسطینیوں کے مقابلے میں 94 گنا زیادہ کیا۔ پرنٹ میڈیا میں، اسرائیل کو یہ حق غزہ کے فلسطینیوں کے مقابلے میں 100 گنا زیادہ مرتبہ دیا گیا۔

2. فلسطینیوں کے قتل کا جواز پیش کرنے کے لیے ''انسانی ڈھال'' کا استعمال

نیوز آؤٹ لیٹس اکثر ''انسانی ڈھال'' کی اصطلاح کو ہر اس مثال پر لاگو کرتے ہیں جہاں کوئی گوریلا فورس سویلین انفراسٹرکچر کے قریب کام کرتی ہے۔ یہ ایک ایسی تعریف ہے جسے انسانی حقوق کے گروپس مسترد کرتے ہیں، لیکن اسے جانبدار لوگ سویلین اموات کی وضاحت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس چیز نے میڈیا آؤٹ لیٹس کو فلسطینی جنگجوؤں کے قریب موجود شہریوں کے بارے میں سینکڑوں بار اس اصطلاح کا حوالہ دینے سے نہیں روکا، جس سے اسرائیلی حملوں میں ان کی اموات کو ضمنی طور پر جائز قرار دیا گیا۔ دوسری طرف ٹی وی نیوز کے میرے تجزیے نے اسرائیلی فوج کی جانب سے ''انسانی ڈھال'' کے استعمال کا کوئی ذکر نہیں دکھایا۔ باوجود ان دستاویزی کیسز کے جہاں اسرائیل کی حکمتِ عملی قانونی تعریف پر پوری اترتی ہے۔

3. شہریوں کے قتل کے بارے میں جذباتی الفاظ

کیبل نیٹ ورکس اور پرنٹ میڈیا آؤٹ لیٹس نے شہریوں کے قتل کی وضاحت کے لیے ''قتلِ عام'' (massacre)، ''وحشیانہ'' (barbaric)، ''سفاکانہ'' (savage) اور ''ذبح'' (slaughter) جیسی اصطلاحات کے استعمال میں اسرائیل کے حق میں مستقل طور پر دوہرا معیار اپنایا۔ 100 دنوں کے اس عرصے کے دوران جس میں تقریباً 24000 فلسطینی مارے گئے، پرنٹ میڈیا میں جن کا میں نے جائزہ لیا، ان جذباتی الفاظ کا استعمال مکمل طور پر اسرائیل کے حق میں رہا۔ (میں نے صرف ان صورتوں کو شامل کیا جب یہ الفاظ آؤٹ لیٹس کی اپنی ادارتی رائے میں استعمال ہوئے، نہ کہ تب جب انہوں نے کنٹری کرنے والوں یا حکام کے اقتباسات دیے)۔

4. فلسطینی اموات کو کم تر دکھانے کے لیے ''حماس کے زیرِ انتظام'' کا استعمال

17 اکتوبر کو اسرائیل کی جانب سے غزہ کے الاہلی عرب ہسپتال پر بمباری کے بعد میڈیا آؤٹ لیٹس نے تقریباً متفقہ طور پر اسرائیل نواز پریشر گروپس کی تحقیر آمیز اصطلاحات ''حماس کے زیرِ انتظام'' یا ''حماس کے زیرِ کنٹرول'' کو فلسطینی اموات کی تعداد بیان کرنے کے لیے اپنا لیا، تاکہ انہیں بے اعتبار کیا جا سکے۔ سی این این یا ایم ایس این بی سی نے 7 اکتوبر سے 17 اکتوبر 2023 کے درمیان یہ اصطلاح استعمال نہیں کی تھی، لیکن جیسے ہی غزہ میں لاشوں کی تعداد بڑھی، اس کا استعمال آسمان کو چھونے لگا حتیٰ کہ ایک متعلقہ جملے کا استعمال سی این این کی سرکاری پالیسی بن گیا۔ یہ سب امریکی محکمہ خارجہ، ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن، ہیومن رائٹس واچ اور دیگر اداروں کے طویل عرصے سے غزہ کی وزارت صحت کے اعداد و شمار استعمال کرنے کے باوجود کیا گیا۔

5. ہمدردی کے مستحق متاثرین: غزہ بمقابلہ یوکرین

غزہ پر اسرائیل کے حملے کے وہ متاثرین جن سے سامعین کی ہمدردی کی توقع کی جا سکتی تھی جیسے صحافی اور بچے انہیں اسرائیل کے حملے کے پہلے 100 دنوں کے دوران یوکرین میں ان کے ہم منصبوں کے مقابلے میں بہت کم کوریج ملی۔

6. سام دشمنی بمقابلہ اسلاموفوبیا

اگرچہ 7 اکتوبر کے بعد کے مہینوں میں سام دشمنی اور اسلاموفوبیا کے واقعات بڑھ رہے تھے، لیکن کوریج تقریباً تمام تر سام دشمنی پر مرکوز رہی اور اس میں اینٹی مسلم تعصب یا غزہ میں بڑے پیمانے پر ہونے والی ہلاکتوں کے امریکہ میں موجود فلسطینیوں پر اثرات کا بہت کم یا بالکل کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ یہ خاص طور پر کالج کیمپسز میں سچ ثابت ہوا، جہاں اسرائیل کی جنگ کے خلاف احتجاج کرنے والے طلباء کو مرکزی دھارے کے پریس میں سام دشمن قرار دے کر بدنام کیا گیا، جب کہ مسلم، عرب اور فلسطینی طلباء جنہیں امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑا، انہیں بمشکل ہی کوئی توجہ ملی۔

7. کیمپس کی سام دشمنی بمقابلہ غزہ میں بچوں کا قتل

فلسطینیوں کو کس طرح غیر انسانی بنایا جاتا ہے اس کی ایک دردناک مثال کے طور پر، ہارورڈ یونیورسٹی کی سابق صدر کلاڈائن گے (Claudine Gay) کے ساتھ میڈیا کے سلوک کا موازنہ ہندر جب کے قتل کی کوریج (یا کوریج کی کمی) سے کریں۔ کلاڈائن گے کی جانب سے کانگریس کے دباؤ میں استعفیٰ دینے کے کچھ ہی عرصہ بعد جو کالج کیمپسز میں سام دشمنی کے الزامات اور 20 سال پرانے سرقہ (plagiarism) کے الزامات پر مبنی مہینوں کی میڈیا توجہ کا نتیجہ تھا اسرائیلی فوج نے ہندر جب اور ان کے خاندان کو لے جانے والی کار پر گولیاں برسائیں اور 5 سالہ فلسطینی بچی کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ نیویارک ٹائمز کے ہوم پیج پر، اسکینڈل کے عروج کے 31 دنوں میں سے 15 دن کلاڈائن گے کے بارے میں کہانیاں شائع ہوئیں، جب کہ ہندر جب اپنی موت کے بعد والے پورے مہینے میں ایک بار بھی وہاں نظر نہیں آئیں۔

مذکورہ بالا حقائق اور اعداد و شمار اس تلخ سچائی کی گواہی دیتے ہیں کہ مغربی میڈیا کا ایک بڑا حصہ خبر رساں ادارے کے بجائے ایک 'بیانیہ ساز مشین' میں تبدیل ہو چکا ہے۔ جب ''دفاع کے حق'' سے لے کر ''انسانی ڈھال'' جیسی اصطلاحات تک کا انتخاب صرف ایک فریق کی حمایت کے لیے وقف کر دیا جائے تو صحافت اپنی اخلاقی ساکھ کھو دیتی ہے۔ ہندر جب جیسی معصوم بچی کی گمشدہ کوریج اور کلاڈائن گے جیسے سیاسی تنازعات پر ضرورت سے زیادہ توجہ یہ ثابت کرتی ہے کہ میڈیا کی نظر میں انسانی جان کی قیمت اس کی جغرافیائی اور سیاسی وابستگی سے طے ہوتی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم بحیثیت قاری میڈیا کے فراہم کردہ مواد کو 'حتمی سچ' ماننے کے بجائے تنقیدی نگاہ سے دیکھیں، کیونکہ جب قلم اور کیمرہ جانبدار ہو جائیں تو وہ انصاف کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔

دی انٹرسیپٹ رپورٹ: ایکیلا لیسی

محمود خلیل کیس میں نیا موڑ

آئی سی ای کی حراست کے دوران ایف بی آئی کی خاموش پسپائی

محمود خلیل کی گرفتاری سے دو دن پہلے، ایک گمنام اطلاع میں ان پر تشدد پر اکسانے کا الزام لگایا گیا تھا۔ ایف بی آئی کے مطابق اس معاملے میں ''مزید تفتیش کی ضرورت نہیں'' ہے، لیکن ٹرمپ انتظامیہ انہیں مسلسل ایک خطرہ قرار دیتی رہی۔

امریکی امیگریشن کی تاریخ میں ایسے واقعات کم ہی ملتے ہیں جہاں کسی فرد کو محض 'گمنام اطلاع' پر اغوا کیا گیا ہو اور پھر وفاقی تحقیقاتی ادارے کی کلین چٹ کے باوجود اسے ملک بدری کے دہانے پر لا کھڑا کیا گیا ہو۔ محمود خلیل کا کیس ٹرمپ انتظامیہ کے ان اقدامات پر سے پردہ اٹھاتا ہے جہاں 'پہلے سزا اور بعد میں جرم کی تلاش' کا فارمولا اپنایا گیا۔ دی انٹرسیپٹ کی اس خصوصی رپورٹ میں ان دستاویزات کا انکشاف کیا گیا ہے جو ثابت کرتی ہیں کہ کس طرح سیاسی ایجنڈے کے تحت حقائق کو نظر انداز کیا گیا۔

حالیہ دنوں میں جاری ہونے والی ایف بی آئی کی ایک فائل نے کولمبیا یونیورسٹی کے اس وقت کے طالب علم اور فلسطینی حقوق کے کارکن محمود خلیل کی گرفتاری سے فوراً پہلے کے ایام پر نئی روشنی ڈالی ہے۔

گزشتہ سال 6 مارچ کو اس واقعے سے دو دن پہلے جب 'امیگریشن اینڈ کسٹمز انفورسمنٹ' (ICE) کے نامعلوم اہلکاروں نے خلیل کو ان کے گھر سے اغوا کر کے گرفتار کیا، ایف بی آئی کو ایک گمنام اطلاع موصول ہوئی جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ خلیل (جن کی عمر غلط طور پر 22 سال بتائی گئی تھی) نے ''حماس کی جانب سے تشدد'' کی کال دی تھی۔

انتہائی حد تک ترامیم شدہ (redacted) دستاویزات کے مطابق، 19 مارچ 2025 تک ایف بی آئی نے اس اطلاع پر اپنی تحقیقات بند کر دی تھیں اور یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ خلیل ''ایف بی آئی کی مزید تحقیقات کے لائق نہیں ہیں''، لیکن تب تک آئی سی ای خفیہ طور پر خلیل کو (جن کی عمر اب 31 سال ہے) ہزاروں میل دور لوزیانا کے ایک حراستی مرکز میں منتقل کر چکی تھی۔ ایف بی آئی کے تحقیقات بند کرنے کے فیصلے کے باوجود ٹرمپ انتظامیہ خلیل کو ''حماس کا حامی'' اور قومی سلامتی کے لیے خطرہ بنا کر پیش کرتی رہی۔

یہ واضح نہیں ہے کہ آیا ایف بی آئی کو ملنے والی اطلاع کا خلیل کی آئی سی ای گرفتاری سے براہ راست تعلق تھا اور ایف بی آئی نے 'دی انٹرسیپٹ' کے اس سوال کا جواب نہیں دیا کہ آیا یہ اطلاع آئی سی ای کے ساتھ شیئر کی گئی تھی یا نہیں۔ تاہم، 'انسٹی ٹیوٹ فار مڈل ایسٹ انڈرسٹینڈنگ' کے ترجمان حامد بن داس نے جو خلیل کی گرفتاری کے بعد سے ان کے ساتھ کام کر رہے ہیں کہا کہ اس واقعے کی ٹائمنگ ''ہم سب کے لیے ایک خطرے'' کی عکاسی کرتی ہے۔

بن داس نے کہا کہ اگرچہ ایف بی آئی کی دستاویز کہتی ہے کہ خلیل مزید تفتیش کے مستحق نہیں تھے، لیکن ''اس چیز نے آئی سی ای کو انہیں حراستی مرکز میں رکھنے اور مہینوں تک ان کی بیوی اور نومولود بیٹے سے الگ رکھنے سے نہیں روکا۔''

یہ دستاویز ایک ایسے وقت میں منظر عام پر آئی ہے جب ٹرمپ انتظامیہ نے خلیل کی ملک بدری کے کیس کو تیز کر دیا ہے، جسے خلیل کی قانونی ٹیم فلسطین کے حق میں ان کی محفوظ

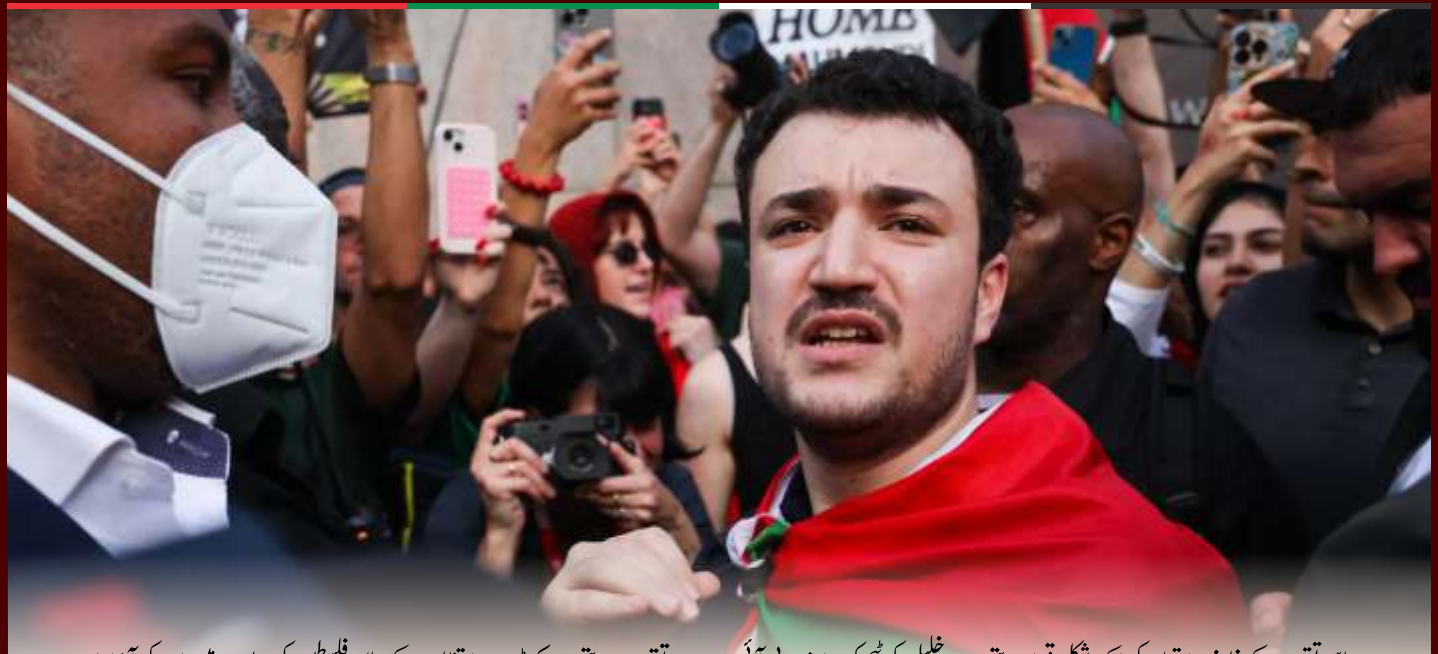

سیاسی تقریر کے خلاف انتقام کی ایک شکل قرار دیتی ہے۔ خلیل کی ٹیم کو یہ ایف بی آئی دستاویز، جو پہلے کبھی رپورٹ نہیں ہوئی تھی، عوامی ریکارڈ کی درخواست پر کیے گئے ایک مقدمے کے ذریعے حاصل ہوئی اور انہوں نے اسے خصوصی طور پر 'دی انٹرسیپٹ' کے ساتھ شیئر کیا۔

خلیل ان ہزاروں طلباء میں سے پہلے فرد تھے جنہیں ٹرمپ انتظامیہ نے پہلی ترمیم (First Amendment) کے تحت حاصل آزادیِ اظہار کے باوجود، فلسطین کی حمایت یا اسرائیل پر تنقید کی بنیاد پر ملک بدری کے لیے نشانہ بنایا۔ ٹرمپ انتظامیہ نے امیگریشن قانون کی ایک مبہم شق کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ خلیل اور دیگر طلباء، جن میں محسن مہداوی اور رومیصہ اوزترک شامل ہیں، امریکی خارجہ پالیسی کے مفادات کے لیے خطرہ ہیں۔ وزیر خارجہ مارکو روبیو جنہوں نے خلیل کی ملک بدری کا حکم دیا تھا، بارہا یہ دعویٰ کر چکے ہیں کہ وہ دہشت گردوں کے ہمدرد تھے، جو کہ ان ہی انتہائی دائیں بازو کے گروہوں کے دعوؤں کی بازگشت ہے جنہوں نے گرفتاری سے پہلے کے مہینوں میں خلیل کو نشانہ بنایا تھا۔ ٹرمپ کا یہ بے مثال کریک ڈاؤن ان سالوں کے حملوں کے بعد سامنے آیا ہے جنہوں نے سابق صدر جو بائیڈن کے دور میں رفتار پکڑی تھی۔

بن داس نے کہا ''انتہا پسندوں اور سازشی نظریہ سازوں کی قیادت میں ٹرمپ کی اس بے لگام صدارت کے دوران ہم میں سے کسی کو بھی وفاقی ایجنٹ آدھی رات کو صرف اسرائیل کی نسل کشی کے لیے امریکی حمایت کے خلاف بولنے پر اغوا کر سکتے ہیں، چاہے حقائق یا آئین کچھ بھی کہیں۔''

'سینٹر فار کانسٹیٹیوشنل رائٹس' (CCR) جو خلیل کی قانونی ٹیم کا حصہ ہے، نے تقریباً ایک سال قبل 29 مئی 2025 کو ان کی گرفتاری سے متعلق عوامی دستاویزات کی درخواست جمع کرائی تھی۔ انکار اور تاخیر کے بعد، CCR نے 20 نومبر کو مقدمہ دائر کیا جس میں دعویٰ کیا گیا کہ ایف بی آئی سمیت وفاقی اداروں نے غلط طریقے سے ریکارڈ روکے رکھے ہیں۔ CCR کا کہنا ہے کہ اسے محکمہ انصاف سے دیگر دستاویزات موصول ہوئی ہیں اور آنے والے مہینوں میں دیگر ایجنسیوں سے بھی مزید کی توقع ہے۔

سی سی آر کی سٹاف اٹارنی سماح سیسی نے کہا ''ایف بی آئی کی جانب سے الزامات کی حمایت میں کوئی ثبوت نہ ملنے پر تحقیقات بند کرنے کے باوجود ٹرمپ انتظامیہ عوامی تبصروں میں مسٹر خلیل کو حماس کا حامی قرار دیتی رہی۔ یہ دستاویز ہمارے اس مؤقف کو مزید تقویت دیتی ہے کہ ٹرمپ انتظامیہ کے پاس فلسطین کی حمایت میں ان کی آزادانہ تقریر کے علاوہ مسٹر خلیل کو نشانہ بنانے کی کوئی جائز وجہ نہیں تھی۔''

ایف بی آئی کے ایک ترجمان نے 'دی انٹرسیپٹ' کو دیے گئے ایک بیان میں کہا ''ہم FOIA عمل کے ذریعے حاصل کردہ دستاویزات کو خود بولنے دیتے ہیں اور مزید تبصرہ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔''

ایف بی آئی فائل پر ردعمل دیتے ہوئے 'فلسطین لیگل' کی ایک وکیل نے ٹرمپ انتظامیہ کے رویے کی مذمت کی لیکن اسے ''فلسطینی کارکنوں کے خلاف عام طور پر استعمال ہونے والے ہتھکنڈوں کا عکاس'' قرار دیا۔

فلسطین لیگل کی سینئر مینیجنگ اٹارنی زوہا خلیلی نے کہا ''انکشافات کہ محمود کے خلاف ان کے سرکاری اغوا سے پہلے جھوٹی رپورٹیں درج کرائی گئی تھیں اور یہ کہ انتظامیہ محمود کے خطرناک ہونے کے جھوٹے دعوے کرتی رہی، حالانکہ ایف بی آئی نے ان دعوؤں کو بے بنیاد پایا تھا، اس انتظامیہ کے وسیع تر اندازِ فکر کی عکاسی کرتے ہیں کہ 'پہلے کارروائی کرو اور جواز بعد میں گھڑو'، جہاں سچائی یا انتظامیہ کے اپنے ماہرین کی تحقیقات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ پوری دنیا میں جو لوگ فلسطینیوں کے لیے آزادی، برابری اور بنیادی ضروریات کا مطالبہ کرتے ہیں انہیں ان کی وکالت کی وجہ سے بدنام کیا گیا، خاموش کیا گیا، ان کے خلاف تحقیقات کی گئیں اور یہاں تک کہ جیلوں میں ڈالا گیا۔''

خلیل کی ٹیم 'بورڈ آف امیگریشن اپیلز' کے اس فیصلے کے خلاف اپیل کرنے کا بھی ارادہ رکھتی ہے جس نے ان کی ملک بدری کی کارروائی ختم کرنے کی درخواست مسترد کر دی تھی۔ وہ اس وقت ایک علیحدہ وفاقی 'ہیبیس کارپس' کیس بھی لڑ رہے ہیں اور جب تک یہ کیس جاری ہے، انہیں ملک بدر نہیں کیا جا سکتا۔

جس وقت محمود خلیل اپنے خاندان اور نوزائیدہ بیٹے سے دور حراستی مرکز کی دیواروں کے پیچھے دن گزار رہے ہیں، اسی وقت یہ دستاویزات چیخ چیخ کر ان کی بے گناہی کا اعلان کر رہی ہیں۔ یہ معاملہ اب صرف ایک مقدمہ نہیں رہا بلکہ امریکہ میں موجود ہزاروں غیر ملکی طلباء اور فلسطینی حقوق کے حامیوں کے لیے ایک انتباہ ہے۔ اگر سچائی کو سرکاری فائلوں میں دبا کر جھوٹے بیانیے کو پروان چڑھایا جاتا رہا، تو انصاف کا حصول محض ایک خواب بن کر رہ جائے گا۔ محمود کی قانونی لڑائی کا نتیجہ جو بھی ہو، مگر تاریخ ٹرمپ انتظامیہ کے اس رویے کو ہمیشہ ایک سیاہ باب کے طور پر یاد رکھے گی۔

نیویارک میں اسرائیلی رئیل اسٹیٹ میلہ

مقبوضہ فلسطینی زمینوں کی نیلامی اور عالمی قوانین کی کھلی خلاف ورزی

نیویارک شہر میں ایک بار پھر وہ متنازع رئیل اسٹیٹ نمائش منعقد کی گئی ہے جس میں مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں غیر قانونی بستیوں کی فروخت کے لیے تشہیر کی جاتی ہے۔ پیر کے روز ہونے والا یہ واقعہ ایک ایسے وقت میں سامنے آیا ہے جب ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا کہ 'اپرایسٹ سائیڈ' میں اسی طرح کی ایک تقریب پر فلسطین نواز اور اسرائیل نواز گروہوں کے درمیان شدید تصادم اور احتجاج دیکھنے کو ملا تھا۔

نمائش کا مقام اور پس منظر: ''دی گریٹ اسرائیلی رئیل اسٹیٹ ایونٹ'' نامی یہ تقریب پیر کی شام جنوبی بروک لین میں واقع ایک آرتھوڈوکس یہودی عبادت گاہ 'ینگ اسرائیل آف مڈوڈ' (Young Israel of Midwood) میں منعقد ہوئی۔

یہ گھومتی پھرتی نمائش (Roving Expo) اسرائیل سے جڑی کئی رئیل اسٹیٹ کمپنیوں کے تعاون سے منعقد کی جاتی ہے اور اس کے لیے اکثر یہودی عبادت گاہوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ گزشتہ ہفتے ہونے والی نمائش میں کم از کم ایک ایسی میز دیکھی گئی جہاں 'کفر الداد' اور 'کارنی شومرون' جیسی بستیوں میں زمین کی فروخت کے اشتہارات موجود تھے۔ واضح رہے کہ عالمی قانون کے تحت مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں اسرائیلی بستیاں تعمیر کرنا اور وہاں زمین کی فروخت غیر قانونی تصور کی جاتی ہے۔

میئر زہران ممدانی کے لیے سیاسی چیلنج: اس تقریب نے نیویارک کے میئر زہران ممدانی کو ایک کٹھن امتحان میں ڈال دیا ہے۔ ممدانی نے اپنی انتخابی مہم فلسطین نواز ساکھ پر لڑی تھی، لیکن اب وہ دوہری تنقید کی زد میں ہیں۔ ایک طرف اسرائیل نواز حلقے غیر قانونی زمینوں کی فروخت کی مذمت پر ان سے نالاں ہیں تو دوسری طرف فلسطین نواز گروپ اور انسانی حقوق کے علمبردار انہیں اس لیے تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں کہ انہوں نے پولیس (NYPD) کو ''بفرزونز'' قائم کرنے کی اجازت دی، جس کے ذریعے مظاہرین کو عبادت گاہوں سے دور رکھا جاتا ہے۔

معاملے کی نزاکت اس وقت مزید بڑھ گئی جب یہ انکشاف ہوا کہ جس عبادت گاہ (ینگ اسرائیل آف مڈوڈ) میں یہ تقریب ہوئی، وہاں شہر کے فنڈز سے چلنے والا ایک سینئر سینٹر بھی قائم ہے۔ سرکاری بجٹ دستاویزات کے مطابق اس مرکز نے 2024 میں محکمہ عمر رسیدہ سے 8 لاکھ ڈالر سے زائد کی رقم وصول کی۔

مظاہرے اور پولیس کی کارروائی: پیر کی شام عبادت گاہ کے گرد و نواح میں صورتحال انتہائی کشیدہ رہی۔ پولیس نے عبادت گاہ کی جانب جانے والے تمام راستے بیریئر لگا کر بند کر دیے تھے۔ فلسطین نواز مظاہرین نے گلیوں میں مارچ کیا، جن کے تعاقب میں اسرائیل نواز گروہ بھی موجود تھے۔

عینی شاہدین کے مطابق اسرائیل نواز گروہ میں شامل نوجوانوں نے جو اسکوٹرز پر سوار تھے، مظاہرین پر مغلظات بکیں اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ ہجوم کی جانب سے انڈے پھینکے گئے اور مظاہرین میں سے ایک نے دعویٰ کیا کہ اس پر 'پیپر سپرے' (کالی مرچ کا سپرے) بھی کیا گیا۔ پولیس نے صورتحال پر قابو پانے کے لیے کم از کم ایک گرفتاری عمل میں لائی۔

حکومتی موقف بمقابلہ انسانی حقوق: میئر ممدانی نے گزشتہ ہفتے پولیس کے رویے کا دفاع کرتے ہوئے کہا تھا کہ شہر کی انتظامیہ احتجاج کے حق اور عبادت گاہوں تک محفوظ رسائی، دونوں کے تحفظ کے لیے پرعزم ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومت کی پالیسیوں پر تنقید کرنا ایک الگ بات ہے، لیکن کسی مخصوص مذہب کے خلاف تعصب یا 'سام دشمنی' (Antisemitism) کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

تاہم 'نیویارک سول لبرٹیز یونین' (NYCLU) نے میئر کے اس موقف کو مسترد کر دیا۔ ادارے کی ڈائریکٹر ڈونا لیبرمین نے ایک سخت بیان میں کہا: ''جب سیاست دان مذہب کی آزادی کو احتجاج پر پابندی لگانے کے بہانے کے طور پر استعمال کرتے ہیں، تو وہ تمام شہریوں کے حقوق مجروح کرتے ہیں۔ گزشتہ ہفتے ہونے والا احتجاج کسی مذہبی عبادت کے خلاف نہیں تھا، بل کہ ایک سیاسی اور کاروباری تقریب کے خلاف تھا جو ایک عبادت گاہ میں منعقد کی جا رہی تھی۔''

نیویارک کی سڑکوں پر پولیس کے بیریئرز، مظاہرین کے نعرے اور عبادت گاہوں کے اندر ہوتی زمینوں کی یہ نیلامی اس تلخ حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ سیاسی مفادات اکثر انسانی حقوق پر غالب آ جاتے ہیں۔ ''مذہبی آزادی'' اور ''عبادت گاہوں کے تقدس'' کو ڈھال بنا کر ایک ایسے کاروبار کو تحفظ فراہم کرنا جو بین الاقوامی سطح پر جرم تسلیم کیا جا چکا ہے، خود نیویارک کی جمہوری ساکھ کے لیے ایک بڑا سوالیہ نشان ہے۔ میئر زہران ممدانی کی انتظامیہ ہو یا نیویارک پولیس، انہیں یہ سمجھنا ہوگا کہ 'امن و امان' کے قیام کا مقصد ناانصافی کو تحفظ دینا نہیں ہونا چاہیے۔ جب تک عالمی طاقتیں اور مقامی ادارے بین الاقوامی قوانین کی کھلی خلاف ورزی پر مصلحت پسندی سے کام لیتے رہیں گے، تب تک انصاف کی فراہمی اور پائیدار امن کا خواب ادھورا ہی رہے گا۔ یہ وقت محض احتجاج کا نہیں بل کہ اس بات پر غور کرنے کا ہے کہ کیا ہم ترقی یافتہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی 'طاقت ہی حق ہے' کے جنگلاتی قانون کو تسلیم کر چکے ہیں؟

مڈل ایسٹ آئی: حافظ عمر فاروق

مائیکروسافٹ اسرائیل کے سربراہ کی برطرفی

فلسطینیوں کی جاسوسی کے لیے ٹیکنالوجی کے استعمال پر انکوائری کے بعد بڑا فیصلہ

اسرائیلی دفاعی مینیجری کی جانب سے مائیکروسافٹ کے 'ایزور' (Azure) پلیٹ فارم کے غلط استعمال پر ہونے والی تحقیقات کے بعد مائیکروسافٹ اسرائیل کے سربراہ اپنے عہدے سے الگ ہوگئے ہیں۔

ایلون ہائیمووچ مائیکروسافٹ اسرائیل کے جنرل مینیجر کے طور پر چار سال خدمات انجام دینے کے بعد رخصت ہو رہے ہیں۔ مالیاتی اخبار 'گلوبز' کی رپورٹ کے مطابق، اب مائیکروسافٹ اسرائیل کے معاملات کی نگرانی مائیکروسافٹ فرانس کے سپرد کر دی جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ مائیکروسافٹ اسرائیل کے گورننس ڈیپارٹمنٹ کے کئی دیگر مینیجرز نے بھی کمپنی کے اخلاقی ضوابط کی خلاف ورزی کے خدشات کے پیشِ نظر اپنے عہدوں سے استعفیٰ دے دیا ہے۔

تحقیقات کا پس منظر

گزشتہ سال مائیکروسافٹ نے اسرائیلی فوج کی جانب سے کمپنی کی ٹیکنالوجی کو ایک ایسے نگرانی کے نظام (Surveillance System) کے لیے استعمال کرنے پر انکوائری کا حکم دیا تھا، جو روزانہ لاکھوں فلسطینیوں کی فون کالز کے مواد کا تجزیہ اور اسے دوبارہ چلانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

یہ انکوائری ان انکشافات کے بعد شروع کی گئی تھی کہ اسرائیل کی انٹیلی جنس ایجنسی (Unit 8200) نے غزہ اور مقبوضہ مغربی کنارے سے ریکارڈ کی گئی کالوں کے وسیع ذخیرے کو محفوظ کرنے کے لیے مائیکروسافٹ کے کلاؤڈ کمپیوٹنگ پلیٹ فارم 'ایزور' کا استعمال کیا تھا۔

انکوائری کے نتائج اور کارروائی

ذرائع کے مطابق یہ تحقیقات حال ہی میں مکمل ہوئی ہیں جس کے نتیجے میں ہائیمووچ کی رخصتی عمل میں آئی۔ برطانوی اخبار 'دی گارڈین' کی رپورٹ کے مطابق، اگرچہ انکوائری کی مکمل تفصیلات واضح نہیں ہیں، تاہم مائیکروسافٹ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ 'یونٹ 8200' نے کمپنی کی سروس کی شرائط کی خلاف ورزی کی ہے۔ مائیکروسافٹ کی پالیسی کے تحت اس کی ٹیکنالوجی کو بڑے پیمانے پر عوامی نگرانی (Mass Surveillance) کے لیے استعمال کرنا ممنوع ہے۔

اس خلاف ورزی کے بعد، مائیکروسافٹ نے مذکورہ انٹیلی جنس یونٹ کی کلاؤڈ سروسز تک رسائی ختم کر دی ہے اور ان مصنوعات کی فراہمی بھی روک دی ہے جو اس نگرانی کے منصوبے میں معاون تھیں، جس کا مقصد ''فی گھنٹہ دس لاکھ کالز'' جمع کرنا تھا۔

ایلون ہائیمووچ کا کردار

دستاویزات کے مطابق، ہائیمووچ نے مائیکروسافٹ اسرائیل اور یونٹ 8200 کے درمیان تعلقات کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہ سلسلہ 2021 میں مائیکروسافٹ کے سی ای او ستیا ناڈیلا اور ایجنسی کے اس وقت کے کمانڈر کے درمیان ہونے والی ملاقات کے بعد شروع ہوا تھا۔

ہائیمووچ نے ایزور کے اندر ایک مخصوص اور الگ تھلگ حصہ (Segregated Area) بنانے کی نگرانی بھی کی تھی تاکہ وہاں حساس انٹیلی جنس مواد کو محفوظ کیا جا سکے۔ اس منصوبے کی تکمیل کے بعد، یونٹ 8200 نے فلسطینیوں کی روزمرہ کی گفتگو کا ایک بہت بڑا آرکائیو مائیکروسافٹ کے کلاؤڈ انفراسٹرکچر میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا۔

مائیکروسافٹ کا موقف اور عوامی ردعمل

اپنے الوداعی ای میل میں ہائیمووچ نے کہا کہ انہوں نے اسرائیل کو دنیا بھر میں مائیکروسافٹ کی تیزی سے ابھرتی ہوئی مارکیٹوں میں سے ایک بنا دیا تھا۔ دوسری جانب، فلسطینی 'بائیکاٹ، ڈیوسٹمنٹ اینڈ سینکشنز' (BDS) تحریک نے مائیکروسافٹ کو اسرائیل کے ''غیر قانونی نسلی پرستی (Apartheid) کے نظام اور غزہ میں جاری نسل کشی'' میں سب سے زیادہ شریک جرم کمپنی قرار دیا ہے۔

مائیکروسافٹ نے پہلے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ ستیا ناڈیلا سمیت اعلیٰ حکام اس بات سے بے خبر تھے کہ یونٹ 8200 فلسطینیوں کی جاسوسی کے لیے ان کا کلاؤڈ استعمال کر رہا ہے۔ کمپنی کے وائس چیئرمین اور صدر بریڈ سمتھ نے گزشتہ سال واضح کیا تھا کہ:

''ہم ایسی ٹیکنالوجی فراہم نہیں کرتے جو شہریوں کی بڑے پیمانے پر جاسوسی میں سہولت کاری کرے۔''

معصوم آنکھیں، خالی ہاتھ

غزہ میں مسلط کردہ بھوک کا ہولناک المیہ

نہتی آبادی، آہنی محاصرہ اور فاقہ کشی کا ظلم

• تاریخ کا شرمناک ترین باب • جب بھوک کو بھی ہتھیار بنا دیا گیا

وہ زخم جو 78
سال بعد بھی تازہ ہے
یومِ نکبہ
ایک نہ ختم ہونے والا المیہ
ہماری مٹی، ہمارا لہو، ہمارا حقِ واپسی!
بچھڑنے کا درد، ملنے کی آس